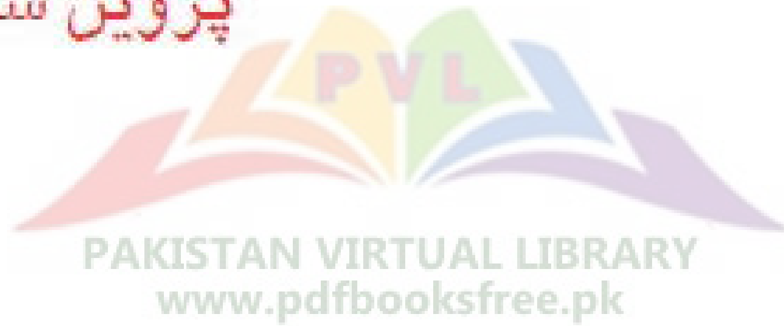
انکار

پروین شاکر

اِنکار

پروین شاکر



پروین قادر آغا کے نام

ترتیب

سج گئی بزمِ رنگ و نُور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آ گیا زینتِ ماہ کے لئے

فرشِ فلک پہ پاؤں رکھ، دیکھ تو کِس طرح سے ہیں
تارے بچھے ہُوئے تری چشمِ سیاہ کے لئے

دل میں یقینِ صُبح کی لَو جو ذرا بلند ہو!
کافی ہے ایک ہی دِیا شب کی سیاہ کے لئے

ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اے مرے شہریارِ حُسن
آئے نہیں تری طرف منصب وجاہ کے لئے

میری پھٹی ہُوئی ردا دے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رُک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

کیا ہُوا گر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرّہ زرفشاں تو ہے تیری کلاہ کیلئے

ہم بھی عجیب لوگ ہیں یا تو بہار گر ہیں یا
سارا چمن جلا دیا اِک پرِ کاہ کیلئے

ایک سہانی صُبح کو شہر جَلا ہُوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِّ الٰہ کے لئے

سارے جہاں سے کٹ گئے، کتنے اکیلے رہ گئے
کِس نے کہا تھا عُمر بھر غم سے نباہ کے لئے



باب حیرت سے مجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے
تہنیت اَے دِل کہ اَب دیوار دَر ہونے کو ہے

کھول دیں زنجیرِ دَر حوض کو خالی کریں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دِل میں کیوں
کیا محبّت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

گردِ رہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہوگیا
خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے

اک چمک سی تو نظر آئی ہے اپنی خاک میں
مجھ پہ بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے

گمشُدہ بستی مسافر لوٹ کر آتے نہیں
معجزہ ایسا مگر بارِ دِگر ہونے کو ہے

رونقِ بازار محفل کم نہیں ہے آج بھی !
سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہمسفر ہونے کو ہے



بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مُجھے اِس خاک سے ہے

خواب میں بھی تجھے بُھولوں تو رَوا رکھ مُجھ سے
وہ روّیہ جو ہوا کا خس وخاشاک سے ہے

بزمِ انجم میں قبا خاک کی پہنی میں نے
اور مری ساری فضلیت اسی پوشاک سے ہے

اتنی روشن ہے تری صبح کہ ہوتا ہے گماں

یہ اُجالا تو کسی دِیدۂ نمناک سے ہے

ہاتھ تو کاٹ دیئے کوزہ گروں کے ہم نے
معجزے کی وُہی اُمیّد مگر چاک سے ہے



کُچھ خبر لائی تو ہے بادِ بہار اُسکی
شاید اس راہ سے گزرے گی سواری اُسکی

میرا چہرہ ہے فقط اُسکی نظر سے روشن
اور باقی جو ہے مضمُون نگاری اُسکی

آنکھ اُٹھا کر جو رَوا دار نہ تھا دیکھنے کا
وہی دِل کرتا ہے اَب مِنّت و زاری اُسکی

رات کی آنکھ میں ہیں ہلکے گلابی ڈورے
نیند سے پلکیں ہُوئی جاتی ہیں بھاری اُسکی

اُس کے دَربار میں حاضر ہوا یہ دِل اورپھر
دیکھنے والی تھی کُچھ کار گزاری اُسکی

آج تو اُس پہ ٹھہرتی ہی نہ تھی آنکھ ذرا!
اس کے جاتے ہی نظر مَیں نے اُتاری اُسکی

عرصۂ خواب میں رہنا ہے کہ لَوٹ آنا ہے
فیصلہ کرنے کی اِس بار ہے باری اُسکی



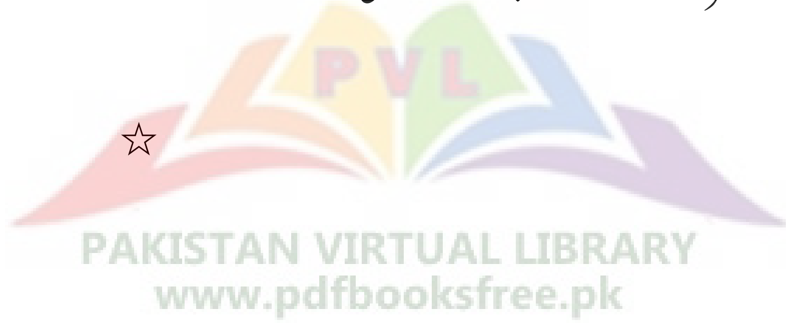
دیکھنے کا جسے کل رات میں ڈھنگ اور ہی تھا
صبح جب آئی تو اُس چشم کا رنگ اَور ہی تھا

شیشۂ جاں کو مرے اتنی ندامت سے نہ دیکھ
جس سے ٹوٹا ہَے یہ آئینہ وہ سنگ اَور ہی تھا

خلق کی بھیجی ہُوئی ساری ملامت اِک سمت
اُس کے لہجے میں چُھپا تیر وتفنگ اور ہی تھا

کیا عرض اِس سے کہ کِس گوشۂ عُزلت میں رہا
شمع کے آگے جب آیا تو پتنگ اَور ہی تھا

لَو چراغوں کی بُجھانے سے ذرا سَا پہلے
میرے سردار کا اندازۂ جنگ اور ہی تھا



☆

شام بھی روشن ہے کچھ جذب دَروں کی ضو بھی ہے
ساتھ اُس کے کوہ پر دیدارِ مَاہِ نو بھی ہے

اَبر ہے' کہُسار ہے اور دستِ شب میں منتظر
اُس لبِ لعلیں کے نام اِک جامِ آب جَو بھی ہے

پیرہن کی اِک جھلک سے بن معطرّ ہوگیا
جیسے موج رنگ میں خوشبو کی کوئی رَو بھی ہے

سطحِ دَریا بڑھ رہی ہے اور ہوائے تند بھی
آج کی شب ہی بہت نیچی دِیے کی لَو بھی ہے

باغ کا حِصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اِتنا نہیں ہے اَور کچھ خود رَو بھی ہے

ایسا لگتا ہے کہ اِس دُنیا سے باہر بھی ہُوں میں،
میرے چہرے میں کسی کے خواب کا پَرتو بھی ہے



شہ نشیں پر چاند اُترا ، اِک پُرانی یاد کا
دِل میں پَرچم سا کُھلا کس قریۂ برباد کا

شہر پر اُس ساعتِ نا سعد کا سایہ ہے اَب
جھٹپٹے کے وقت کیوں پتّھر رکھا بنیاد کا

بستیوں کی گونج پُر اَسرار سی ہونے لگی
جیسے سنّاٹا پکارے شہرِ نا آباد کا

چہرۂ کُہسار کا دِکھلا گیا اِک اَور رنگ،
ثانیے بھر کے لئے دیدار برق و رَعد کا

ایک اَن دیکھی خوشی رقصاں ہے برگ و بار میں
باغِ ہستی میں مرے موسم ہے اَبر و باد کا

مَیں تو اُڑنا بُھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دِل مگر مُجھ سے مِرے صیّاد کا



شرارِ برق سے سَارا جہان روشن تھا
عجیب طرح سے کل آسمان روشن تھا

ورائے چشم بھی اِک روشنی فضا میں تھی
کوئی مکان سے تالا مکان روشن تھا

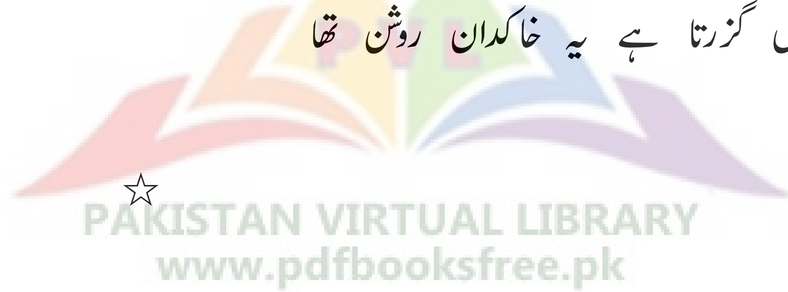
میں اُس کے ساتھ روانہ تھی کِن فضاؤں کو
زمیں کا چہرہ فلک کے سمان روشن تھا

وصالِ روح و نظر کے عجیب لمحے میں
ہر ایک زاویۂ جسم و جان روشن تھا

فراق میں ہی رہے ہم تو ساری عُمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیکِ جان روشن تھا

سپیدیٔ خطِ ساحل نظر میں تھی جَب تک
مِرا ستارۂ ' ترا بادبان روشن تھا

طلوعِ انجم و تکوینِ مہر سے پہلے
گماں گزرتا ہے یہ خاکدان روشن تھا



☆

ہوا مہک اُٹھی ' رنگ چمن بدلنے لگا
وہ میرے سامنے جب پیرہن بدلنے لگا

بہم ہُوئے ہیں تو اب گفتگو نہیں ہوتی
بیان حال میں طرزِ سخن بدلنے لگا

اندھیرے میں بھی مُجھے جگمگا گیا ہے کوئی
بس اِک نگاہ سے رنگ بدن بدلنے لگا

ذرا سی دیر کو بارش رُکی تھی شاخوں پر
مزاج سوسن و سرو سمن بدلنے لگا

فرازِ کوہ پہ بجلی کُچھ اس طرح چمکی
لباس وادی و دشت و دمن بدلنے لگا



تری نظر میں کہاں باریاب ہونا تھا
تمام عمر یہی اِضطراب اب ہونا تھا

صبا چلی ہے جس انداز سے گلستاں میں
کِسی کو لالہ، کسی کو گُلاب ہونا تھا

بڑی اُمید تھی کارِ جہاں میں دِل سے مگر
اسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا

سفر کی رات مسافر کی میزبانی کو
کوئی ستارہ، کوئی ماہتاب ہونا تھا

بس اتنی عمر تھی اُس سرزمینِ دل پہ مری
پھر اس کے بعد اِسے وہم خواب ہونا تھا



زندگی کُوئے ملامت میں تو اَب آئی ہے
اَور کُچھ چاہنے والوں کے سبب آئی ہے

ہم فقیروں میں کسی طور شکایت تیری
لب پہ آئی بھی تو تاحدِ ادب آئی ہے

پُھول سے کِھلتے چلے جاتے ہیں جیسے دل میں
اس گلستاں میں عجب موجِ طرب آئی ہے

میری پوشاک میں تارے سے اچانک چمکے
کِس کے آنگن سے یہ ہوتی ہوئی شب آئی ہے

کِس سے پُوچھوں پسِ دیوار چمن کیا گزری
میرے گھر میں تو ہوا مُہر بہ لب آئی ہے

کون سے پُھول تھے کل رات ترے بستر پر
آج خوشبُو ترے پہلو سے عجب آئی ہے



حیراں ہجُومِ رنگ میں یہ چشم کب سے ہے
اِس باغ میں بہار کسی کے سبَب سے ہے

کب شکوۂ تغافل و بیدار سب سے ہے
تُجھ سے گلہ ہے اور نہایت اَدب سے ہے

ہر شے میں حُسن اُس کے مقابل سے آئے گا

مہتاب کا جمال بھی زنگارِ شب سے ہے

یہ عشق ہے اور اس میں سرافرازی و کمال
رخسار و خال و خط سے نہ نام و نسب سے ہے

اِس دل میں شوقِ دید زیادہ ہی ہوگیا
اُس آنکھ میں مرے لئے انکار جب سے ہے

☆

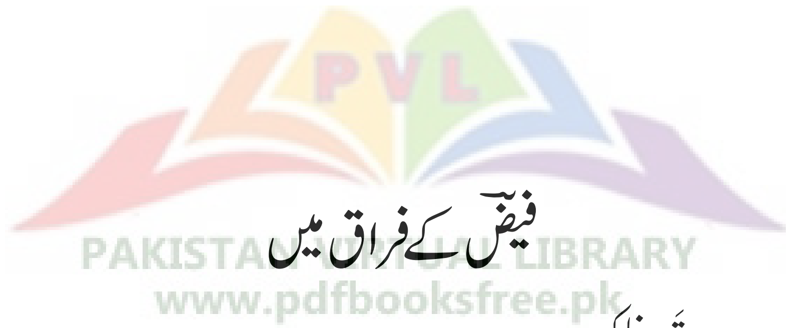
ایک اُداس نظم

یہ حسین شام اپنی
ابھی جس میں گُھل رہی ہے
ترے پیرہن کی خوشبو
ابھی جس میں کِھل رہے ہیں
مرے خواب کے شگوفے
ذرا دیر کا ہے منظر!
ذرا دیر میں اُفق پہ
کِھلے گا کوئی ستارہ
تری سمت دیکھ کر وہ
کرے گا کوئی اشارہ
ترے دِل کو آئیگا پھر
کِسی یاد کا بُلاوا
کوئی قصّۂ جُدائی

کوئی کارِ نامکمل
کوئی خوابِ نا شگفتہ
کوئی بات کہنے والی
کِسی اور آدمی سے !

ہمیں چاہیے تھا مِلنا
کِسی عہد مہرباں میں
کِسی کے خواب یقیں میں
کِسی اَور آسماں پر
کِسی اور سَر زمیں میں!





فیضؔ کے فراق میں

تہِہِ خاک

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہُوئی ہوا
کفِ دستِ بادِ صبا سے پُھول یہ کیا گِرا
چمنِ نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں
ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں
پُلِ سبز پر کوئی انجم راہِ فروز اب نہیں خیمہ کَش
وہ غُبار اُٹھا ہے کہ سُوجھتا نہیں راستہ
مرے ماہتاب کہاں ہے تُو
کوئی اور بھی ہے نظام مہر و نجوم جس کو رواں ہے تُو
ترے فرشِ نیلوفری پہ کون سے بُرج کی یہ کشش بڑھی

کہ طلسم خانۂ ہست میں تری روشنی کا قیام اتنا لکھا گیا
مرے لَے نواز
قبائے ساز ترے فراق میں چاک ہے
وہ سکوت شہرِ سخن میں ہے
کہ صدائے گریۂ شبنم شبِ تار دل کو سنائی دے
تہِ ہفت حجلۂ نور ایک ہی خواب ہے
کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے!
کوئی سِلسلہ ہو کہ راہ پھر سے سُجھائی دے!



تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مُجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے
چُوم کر پُھول کو آہستہ سے
معجزہ بادِ صبا کرتی ہے
کھول کر بندِ قبا، گُل کے، ہوا
آج خوشبو کو رِہا کرتی ہے
ابر برسے تو عنایت اُس کی
شاخ تو صرف دعا کرتی ہے
زندگی پھر سے فضا میں روشن
مشعلِ برگِ حنا کرتی ہے
ہم نے دیکھی ہے وہ اُجلی ساعت
رات جب شعر کہا کرتی ہے
شب کی تنہائی میں اب تو اکثر

گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے

دِل کو اُس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مُجھے تجھ سے جُدا کرتی ہے

زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رَہا کرتی ہے

اُس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ
دِل کا احوال کہا کرتی ہے

مصحف دل پہ عجب رنگوں میں
ایک تصویر بنا کرتی ہے

بے نیاز کفِ دریا انگشت
ریت پر نام لکھا کرتی ہے

دیکھ تو آن کے چہرہ میرا
اِک نظر بھی تری ، کیا کرتی ہے

زندگی بھر کی یہ تاخیر اپنی
رنج ملنے کا سودا کرتی ہے

شام پڑتے ہی کسی شخص کی یاد
کوچۂ جاناں میں صدا کرتی ہے

مسئلہ جب بھی چراغوں کا اُٹھا
فیصلہ صرف ہوا کرتی ہے

ق

مُجھ سے بھی اس کا ہے ویسا ہی سلوک
حال جو تیرا انا کرتی ہے

دُکھ ہُوا کرتا ہے کچھ اور بیاں
بات کچھ اور ہُوا کرتی ہے



اِک ہُنر تھا ، کمال تھا کیا تھا
مُجھ میں تیرا جمال تھا کیا تھا

تیرے جانے پہ اَب کے کچھ نہ کہا
دِل میں ڈر تھا ، ملال تھا کیا تھا

برق نے مجھ کو کردیا روشن
تیرا عکسِ جلال تھا کیا تھا

ہم تک آیا تو مہرِ لطف وکرم
تیرا وقتِ زوال تھا کیا تھا

جس نے تہہ سے مُجھے اُچھال دیا
ڈُوبنے کا خیال تھا کیا تھا

جس پہ دِل سارے عہد بُھول گیا
بُھولنے کا سوال تھا کیا تھا

تتلیاں تھیں ہم اور قضا کے پاس
سُرخ پھولوں کا جال تھا کیا تھا



اے رنج بھری شام

دہلیزِ سماعت پہ کسی وعدے کی آہٹ
اُترے کہ نہ اُترے
اے رنج بھری شام!
دُکھتے ہُوئے دل پر

کوئی آہستہ سے آ کر
اِک حرفِ تسلّی تو رکھے پُھول کی مانند!



ایک پیغام

وہ موسم ہے
بارش کی ہنسی
پیڑوں میں چھن چھن گونجتی ہے
ہری شاخیں
سنہری پھول کے زیور پہن کر
تصور میں کسی کے مسکراتی ہیں
ہوا کی اوڑھنی کا رنگ پھر ہلکا گلابی ہے
شناسا باغ کو جاتا ہوا خوشبو بھرا رستہ
ہماری راہ تکتا ہے
طلوعِ ماہ کی ساعت
ہماری منتظر ہے



وہ کیسی ، کہاں کی زندگی تھی
جو تیرے بغیر کٹ رہی تھی
اُس کو جب پہلی بار دیکھا

میں تو حیران رہ گئی تھی

وہ چشم تھی سحر کار بے حد
اَور مُجھ پہ طلسم کررہی تھی

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مُجھ میں کسی رنگ کی کمی تھی

صحرا کی طرح تھیں خشک آنکھیں
بارش کہیں دل میں ہورہی تھی

آنسُو مرے چومتا تھا کوئی
دُکھ کا حاصل یہی گھڑی تھی

سُنتی ہوں کہ میرے تذکرے پر
ہلکی سی اُس آنکھ میں نمی تھی

غربت کے بہت کڑے دنوں میں
اُس دل نے مجھے پناہ دی تھی

سب ِگرد تھے اُس کے اور ہم نے
بس دُور سے اک نگاہ کی تھی



تیرے اُجالے کیا کسی اور دیار بس گئے
اے مرے ماہِ نیم ماہ لوگ تجھے ترس گئے

تیرے کَرم کی دُھوپ تو خیر کسے نصیب تھی
تیرے سِتم کے اَبر بھی اَور کہیں بَرس گئے

تیری رضا کے سامنے اَب ہمیں دیکھنا ہے کیا
عشق کے امتحان میں ذہن کے پیش و پس گئے

ساری فضائے حرف و صوت عطر مزاج ہوگئی
بزمِ سخن سے ہو کے آج کیسے حنا نفس گئے

کیا انہیں میری خاک سے بُوئے رفاقت آئی تھی
اُس کی گلی میں دُور تک کیسے یہ خار و خس گئے



ہم نے ہی لوٹنے کا ارادہ نہیں کیا
اُس نے بھی بُھول جانے کا وعدہ نہیں کیا

دُکھ اوڑھتے نہیں کبھی جشنِ طرب میں ہم
ملبوسِ دل کو تن کا لبادہ نہیں کیا

جو غم ملا ہے بوجھ اٹھایا ہے اُس کا خود
سر زیرِ بارِ ساغر و بادہ نہیں کیا

کارِ جہاں ہمیں بھی بہت تھے سفر کی شام
اُس نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا

آمد پہ تیری ، عطر و چراغ و سبو نہ ہوں

اتنا بھی بود و باش کو سادہ نہیں کیا



اِس بار تو اپنے پاس تھے ہم
پھر کس کے لئے اُداس تھے ہم

آئی تھی ہمیں رفوگری بھی
اِک دُوسرے کا لباس تھے ہم

کُچلے گئے جب بھی سر اُٹھایا
فٹ پاتھ کی ایسی گھاس تھے ہم

ممنوع قرار پاگئے ہیں!
جس بزم میں حرفِ خاص تھے ہم

جلتے رہے' ہر ہوا کے آگے
کیا جانیئے کس کی آس تھے ہم



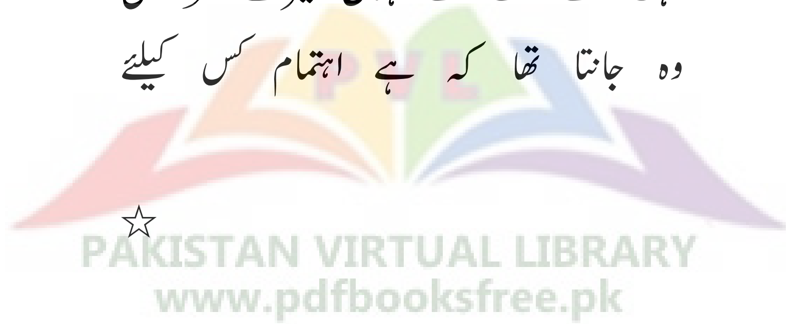
کِھلا ہے آج دلِ لالہ فام کس کیلئے
وہ جاچکا ہے تو آئی ہے شام کس کیلئے

جو پُھول کِھلنے تھے وہ راکھ ہوچکے ہوں گے
نسیمِ صبح کو اب اذان عام کس کیلئے

وہ گُل عذار نہیں ہوگا اَب چمن آرا
صبا کے ہاتھ سلام و پیام کس کیلئے

وہ مے گسار تو اے بادِ نو بہار گیا
شراب سُرخ سے بھرتی ہے جام کس کیلئے

بہت سے لوگ تھے مہمان میرے گھر لیکن
وہ جانتا تھا کہ ہے اہتمام کس کیلئے



☆

ایک دفنائی ہُوئی آواز

پُھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے
تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی
آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا بچہ
لیکن اس آسائش 'اس ٹھنڈک کے رنگ محل میں
جہاں کہیں جاتی ہوں
بنیادوں میں بے حد گہری چُنی ہُوئی
اک آواز برابر گریہ کرتی ہے
مجھے نکالو!

مجھے نکالو!



مُراد

بھیڑیے!

میرے چاروں طرف بھیڑیے

آنکھیں، حلقوں سے باہر

زبانیں بھی نکلی ہوئی

دھونکنی کی طرح سانس چلتی ہوئی

میرے اطراف حلقہ کئے

ایک لمحے کی غفلت کے یُوں منتظر

جس طرح کوئی ماہر شکاری

دانہ ودام بھی

سنگِ الزام بھی

جاہ وانعام بھی

جاں حاضر ہے ہر شکل کا!

پر مرے گرد

ایسا الاؤ ہے روشن

کہ ہر حیلہ ومکر کے باوجود

یہ درندے

فاصلے کو نبھانے پہ مجُبور ہیں

بھیڑیے آگ میں پاؤں رکھتے نہیں!



شرارت سے بھری آنکھیں

ستاروں کی طرح سے جگمگاتی ہیں
شرارت سے بھری آنکھیں!
مرے گھر میں اُجالا بھر گیا
تیری ہنسی کا
یہ ننھے ہاتھ جو گھر کی کوئی شے
اب کسی ترتیب میں رہنے نہیں دیتے
کوئی سامانِ آرائش نہیں اپنی جگہ پر اب
کوئی کیاری سلامت ہے
نہ کوئی پُھول باقی
یہ مٹّی میں سنے پاؤں
جو میری خواب گہ کی دُودھیا چادر کا ایسا حال کرتے ہیں
کہ کچھ لمحے گزرنے پر ہی پہچانی نہیں جاتی
مگر میری جبیں پر بل نہیں آتا
کبھی رنگوں کی پچکاری سے
سرتاپا بھگو دینا
کبھی چُنری چھپا دینا
کبھی آنا عقب سے
اور مری آنکھوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر
پُوچھنا تیرا
بھلا میں کون ہُوں
بوجھیں تو جانوں!

میں تجھ سے کیا کہوں

تُو کون ہے میرا

مرے نٹ کھٹ کنہیا!

مجھے تو عِلم ہے اتنا

کہ یہ بے نظم اور ناصاف گھر

میری توازن گر طبیعت پر

گراں بننے نہیں پاتا

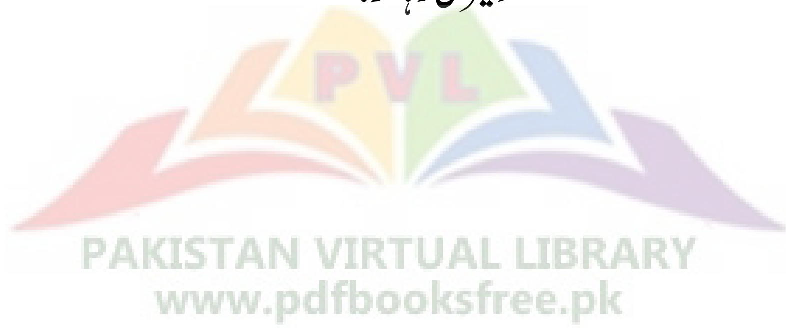
اگر تُو میرے آنگن میں نہ ہوتا

تو میرے خانۂ آئینہ ساماں میں

بہ ایں ترتیب و آرائش

اندھیرہی رہا کرتا!





سفر اَب جتنا باقی ہے..........

بہت سردی ہے ____ ممّا

ابھی کُچھ دیر

میرا ہاتھ مت چھوڑیں!

زمستاں کی ہوا سے کپکپاتا

تُو کہہ رہا تھا!

زیادہ دن نہیں گزرے

کہ میری گود کی گرمی

تجھے آرام دیتی تھی

گلے میں میرے بانہیں ڈال کرتو اس طرح سوتا

کہ اکثر ساری ساری رات میری
ایک کروٹ میں گزر جاتی!

مرے دامن کو پکڑے
گھر میں تتلی کی طرح سے گھومتا پھرتا
مگر پھر جلد ہی تجھ کو
پرندوں اور پھولوں
اور پھر ہمجولیوں کے پاس سے ایسا بلاوا آ گیا
جس کو پا کر
مری اُنگلی چھڑا کر
تو ہجومِ رنگ میں خوشبو کی صورت مل گیا تھا
پھر اس کے بعد
خوابوں سے بھرا بستہ لئے
اسکول کی جانب روانہ ہو گیا تُو
جہاں پر رنگ اور پھر حرف اور پھر ہندسے
اور سو طرح کے کھیل تیرے منتظر تھے
دِل لُبھاتے تھے
ترے اُستاد مُجھ سے معتبر تھے
دوست مُجھ سے خُوب تر تھے
مُجھے معلُوم ہے
میں تُجھ سے پیچھے رہ گئی ہوں
سفر اَب جتنا باقی ہے
وہ بس پسپائی کا ہی رہ گیا ہے
تری دُنیا میں اب ہر پل
نئے لوگوں کی آمد ہے
میں بے حد خامشی سے

ان کی جگہیں خالی کرتی جارہی ہوں

ترا چہرہ نکھرتا جارہا ہے

میں پس منظر میں ہوتی جارہی ہوں!

زیادہ دن نہ گزریں گے

مرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت

تُجھے کافی نہیں ہوگی

کوئی خوش لمس دستِ یاسمیں آکر

گلابی رنگت حدّت

تیرے ہاتھوں میں سمودے گا

مرا دِل تجھ کو کھودے گا

میں باقی عُمر

تیرا راستہ تکتی رہوں گی

مَیں ماں ہُوں

اور مری قسمت جُدائی ہے!



اپنے بیٹے کیلئے ایک نظم

مرے بچّے نے پہلی بار اٹھایا ہے قلم

اور پُوچھتا ہے

کیا لکھوں مما؟

میں تُجھ سے کیا کہوں بیٹے

کہ اَب سے برسوں پہلے

یہ لمحہ جب مری ہستی میں آیا تھا

تو میرے باپ نے مجھ کو سکھائے تھے

محبت اور نیکی اور سچائی کے کلمے

مرے توشے میں ان لفظوں کی روٹی رکھ کے وہ سمجھ تھا

میرا راستہ کٹ جائیگا

آگے سفر آسان ہو جائے گا شاید!

محبت مجھ سے دُنیا نے وُصولی

قرض کی مانند

نیکی سُود کی صُورت میں

حاصل کی

مری سچائی کے سکے

ہُوئے رد اس طرح سے

کہ میں فوراً سنبھلنے کی نہ گر تدبیر کرتی

تو سر پر چھت نہ رہتی

تن پہ پیراہن نہیں بچتا

میں اپنے گھر میں رہ کر

عمر بھر جزیہ ادا کرتی رہی ہوں!

زمانہ

میرے خدشوں سے سوا عیار تھا

اور زندگی

میری توقع سے زیادہ بے مرّوت تھی

تعلّق کے گھنے جنگل میں

بچھّو سرسراتے تھے

مگر ہم اس کو سرشاری میں

فصلِ گُل کی سرگوشی سمجھتے تھے

پتہ ہی کچھ نہ چلتا تھا

کہ خوابوں کی چھپر کھٹ پر

لباسِ ریشمیں

کس وقت بن کر کینچلی اترا

مخاطب کے رو پہلے دانت

کب لمبے ہوئے

اور کان

کب پیچھے مُڑے

اور پاؤں

کب غائب ہُوئے یکدم!

میں اس کِذب وریا

اس بے لحاظی سے بھری دُنیا میں رہ کر

محبت اور نیکی اور سچائی کا ورثہ

تُجھ کو کیسے منتقل کردوں

مُجھے کیا دے دیا اُس نے!

مگر میں ماں ہوں

اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے

تو دُنیا ختم ہو جائے

سو میرے خوش گماں بچے!

تو اپنی لوحِ آئندہ پہ

سارے خوبصورت لفظ لکھنا

سدا سچ بولنا

احسان کرنا

پیار بھی کرنا

مگر آنکھیں کُھلی رکھنا!



جُدائی کی پہلی رات

آنکھ بوجھل ہے
مگر نیند نہیں آتی ہے
میری گردن میں حمائل تری بانہیں جو نہیں
کِسی کروٹ بھی مجھے چین نہیں پڑتا ہے
سرد پڑتی ہُوئی رات
مانگنے آئی ہے پھر مُجھ سے
ترے نرم بدن کی گرمی
اور دریچوں سے جھجکتی ہُوئی آہستہ ہوا
کھوجتی ہے مرے غم خانے میں
تیری سانسوں کی گلابی خوشبو!

میرا بستر ہی نہیں
دل بھی بہت خالی ہے
اِک خلا ہے کہ مری روح میں دہشت کی طرح اُترا ہے
تیرا ننھا سا وجود
کیسے اُس نے مُجھے بھر رکھا تھا
ترے ہوتے ہوئے دُنیا سے تعلق کی ضرورت ہی نہ تھی
ساری وابستگیاں تُجھ سے تھیں
تُو مری سوچ بھی، تصویر بھی اور بولی بھی
میں تری ماں بھی، تری دوست بھی، ہمجولی بھی
تیرے جانے پہ کُھلا
لفظ ہی کوئی مُجھے یاد نہیں

بات کرنا ہی مجھے بھول گیا!

تُو مری روح کا حِصہ تھا

مرے چاروں طرف

چاند کی طرح سے رقصاں تھا مگر

کس قدر جلد تری ہستی نے

مرے اطراف میں سُورج کی جگہ لے لی ہے

اب ترے گرد میں رقصندہ ہوں!

وقت کا فیصلہ تھا

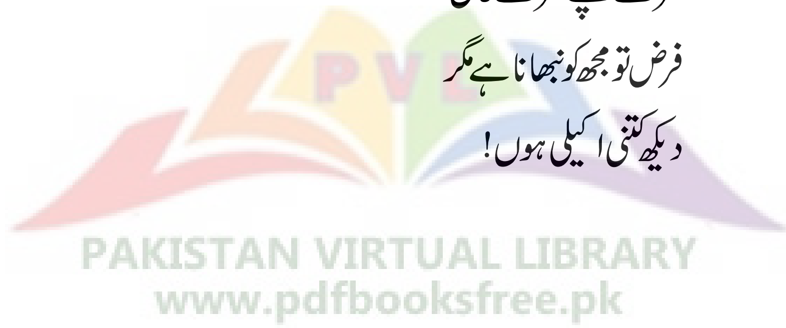
ترے فردا کی رفاقت کیلئے

میرا امروز اکیلا رہ جائے

مرے بچے، مرے لال

فرض تو مجھ کو نبھانا ہے مگر

دیکھ کتنی اکیلی ہوں!





بیٹھی ہے بال کھولے ہُوئے میرے پاس شب

آئی ہے کون شہر سے اتنی اُداس شب

میں چُپ رہی تو رات نے بھی ہونٹ سی لئے

میں اس کا پیرہن ہُوں تو میرا لباس شب

گھر جلد لوٹ کر بھی تو منظر وہی رہا

ویسی ہی سرد شام وہی نا سپاس شب

شاید کہ کل کی صبح قیامت ہی بن کے آئے

اُتری ہے جسم و جان پہ بن کر ہراس شب

سُورج کو دیکھنے کا سلیقہ کہاں ہمیں!
جب بھی نظر اُٹھائی، رہی آس پاس شب

اے ماہ و مہرِ حُسن، ترے عہد میں کبھی
دِن ہی ہمیں خوش آئے نہ آئی ہے راس شب

مدّت کے بعد چاند نے دستک بدن پہ دی
پھر حجلۂ حیات میں آئی ہے خاص شب



نظر کے سامنے اِک راستہ ضروری ہے
بھٹکتے رہنے کا بھی سلسلہ ضروری ہے

مثالِ ابر و ہوا دل بہم رہیں لیکن
محبتوں میں ذرا فاصلہ ضروری ہے

وہ خوف ہے کہ سرِ شام گھر سے چلتے وقت
گلی کا دُور تلک جائزہ ضروری ہے

مِلے اس آنکھ کو بھی تیرے خواب کی اُجرت
چراغِ کشتہ کو اِتنا صلہ ضروری ہے

نجانے فیصلہ باقی کہ اختلاف رہے
کنارِ متن کوئی حاشیہ ضروری ہے

تعلقات کے نامعتبر حوالوں میں
تمام عمر اِک رابطہ ضروری ہے



اَب اور جینے کی صُورت نظر نہیں آئی
کِسی طرف سے بھی اچھی خبر نہیں آتی

اُسی کے آس میں ہے دِل کا حجرۂ تاریک
وہ روشنی جو کبھی میرے گھر نہیں آتی

وہُ مہرباں ہے تو محراب و بام تک نہ رہے
یہ دُھوپ کیوں پسِ دیوار و دَر نہیں آتی

رہِ حیات میں اب کوئی ایسا موڑ نہیں
کہ جِس کے بعد تری رہگزر نہیں آتی

قبولیت کی ہے ساعت تو اُسکو مانگ ہی لیں
کہ یہ گھڑی کبھی بارِ دگر نہیں آتی

سرائے خانہ دُنیا میں شام ہوتی ہے
مسافروں کو نوید سفر نہیں آتی



پھر ایک بار تجھی سے سوال کرنا ہے
نگاہ میں ترا منصب بحال کرنا ہے

لہُو سے سینچ دیا اور پھر یہ طے پایا
اِسی گلاب کو اب پائمال کرنا ہے

اِس ایک مرہمِ نو روز و لمسِ تازہ سے
پُرانے زخموں کا بھی اندمال کرنا ہے

یہ غم ہے اور ملا ہے کسی کے دَر سے ہمیں
سو اِس شجر کی بہت دیکھ بھال کرنا ہے

بُھلا کے وہ ہمیں حیران ہے تو کیا کہ ابھی
اِسی طرح کا ہمیں بھی کمال کرنا ہے

☆

مقتلِ وقت میں خاموشی گواہی کی طرح
دل بھی کام آیا ہے گمنام سپاہی کی طرح

ایک لمحے کو زمانے نے رضا پوچھی تھی
گفتگو ہونے لگی ظلِّ الٰہی کی طرح

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا
خامشی بھی تو ہُوئی پشت پناہی کی طرح

اُس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اَور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

گُھّپ ایک دیا اور ہوا کی اقلیم
پھیلتی جائے مقدر کی سیاہی کی طرح





پَھیلا ہُوا ہے حدِّ بصارت میں نُور کیا
مہتاب نے کیا مرے اندر ظہُور کیا

خود پھُول کی طرح مُجھے کِھلنے کا شوق تھا
اَب تیز ہے ہَوا تو ہَوا کا قصُور کیا

اِک نقش موجِ آبِ رواں پر بنا ہوا
ایسے ہنر پہ فکرِ سخن کا غُرور کیا

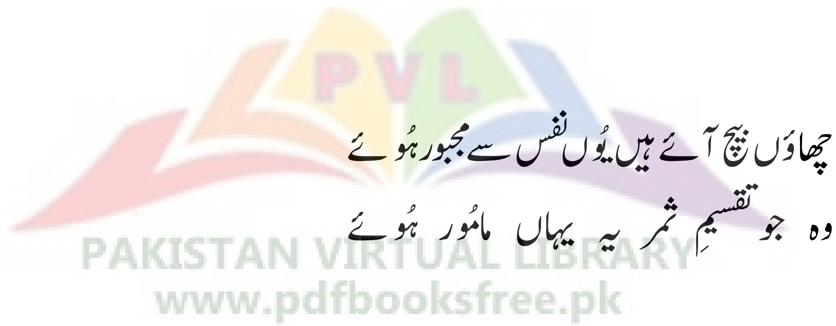
جب آمدِ بہار کا امکان نہیں
پھر نغمہ سنج ہوں گے فضا میں طیور کیا

ہر چیز فاصلے پہ نظر آئی ہے مجھے
اِک شخص زندگی میں ہُوا مُجھ سے دُور کیا

سب خیریت کا حُسن کے بدن سرد پڑ گئے
کِس کو نہیں خبر کہ ہے بین السطُور کیا

تکریمِ زندگی سے بھی اَب دست کش ہیں ہم
اِس سے زیادہ نذر گزاریں حُضور کیا





چھاؤں بیچ آئے ہیں یُوں نفس سے مجبور ہُوئے
وہ جو تقسیمِ ثمر پہ یہاں مامُور ہُوئے

شعبۂ رزق خُدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بد دل و رنجُور ہُوئے

وہی شدّاد ، وہی جنّتِ خاشاک نہاد
ویسے ہی عظمتِ یک لحظہ پہ مغرُور ہوئے

وہ رعونت ہے کہ لگتا ہے ازل سے ہیں یونہی
نشّۂ مسندِ شاہانہ سے مخمور ہُوئے

اپنی تقویم میں اب منظرِ فردا تو نہیں

عکسِ معزول سے کچھ اس طرح مسحُور ہُوئے

ہم وہ شہزادِ سیہ بخت کہ دشمن کی بجائے
اپنے لشکر کے سبب شہر میں محصور ہُوئے

اَب تو بس خواب کی بیساکھی پہ چلنا ہوگا
مُدتیں ہوگئیں اس آنکھ کو معذُور ہُوئے



نشاطِ غم

دسمبر کا کوئی یخ بستہ دن تھا

میں یورپ کے نہایت دُور افتادہ علاقے کی

کِسی ویران طیراں گاہ میں

بالکل اکیلی بنچ پر بیٹھی تھی

اعلانِ سفر کی منتظر تھی

جہاں تک آنکھ شیشے کے اُدھر جاتی

اُداسی سے گلے ملتی

مسلسل برفباری ہو رہی تھی!

اچانک میں نے اپنے سے مخاطب

بہت مانوس اِک آواز دیکھی

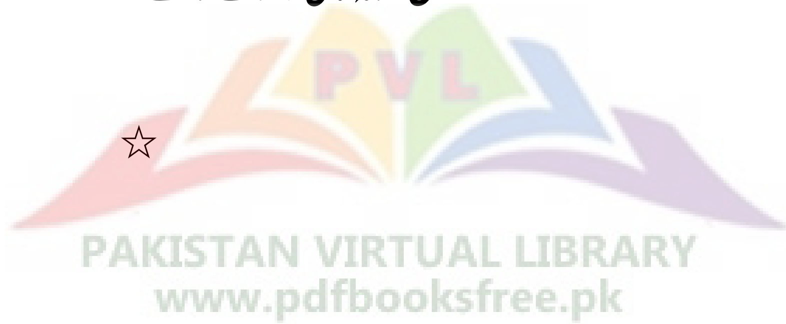
''آپ کیسی ہیں؟

اکیلی ہیں؟

گھنے بالوں، چمکتی بھوری آنکھوں"
دلنشیں باتوں سے پُر
وہ پُرکشش لڑکا کہاں ہے؟
آپ دونوں ساتھ کتنے اچھے لگتے تھے!

مرے چہرے پہ اک سایہ سالہرایا تھا شاید
وہ آگے کچھ نہیں بولا!

میرا دل دُکھ سے کیسا بھر گیا تھا
مگر تہہ میں خوشی کی لہر بھی تھی
پُرانے لوگ ابھی بھولے نہیں ہم کو
ہمیں بچھڑے، اگرچہ
آج سولہ سال تو ہونے کو آئے!



☆

وُہ ہم نہیں جنہیں سہنا یہ جبر آجاتا
تری جُدائی میں کِس طرح صبر آجاتا

فصیلیں توڑ نہ دیتے جو اَب کے اہلِ قفس
تو اور طرح کا اعلانِ جبر آجاتا

وُہ فاصلہ تھا دُعا اور مستجابی میں
کہ دُھوپ مانگنے جاتے تو اَبر آجاتا

وُہ مُجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا

برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

وزیر و شاہ بھی خس خانوں سے نکل آتے
اگر گمان میں انگارِ قبر آجاتا



اُس سے ملنا ہی نہیں ' دِل میں تہیہ کرلیں
وُہ خود آئے تو بہت سَرد رویہ کرلیں

ایک ہی بار گھر راکھ ہو' جاں تو چھُوٹے
آگ کم ہے تو ہَوا اور مہیا کرلیں

کیا ضمانت ہے کہ وہ چاند اُتر آئے گا
تارِ مژگان کو اگر عقدِ ثریا کرلیں

سانس اُکھڑ جاتا ہے اَب وقت کی ہم گامی میں
جی میں آتا ہے کہ ہم پاؤں کو پہیہ کرلیں

کوئی پُوچھے کہ زباں کیا ہے تری تو پرویؔن
وقت ایسا ہے کہ بہتر تقیّہ کرلیں



حبس بہت ہے

حبس بہت ہے
اشکوں سے یُوں آنچل گیلے کر کے ہم
دل پر کب تک ہوا کریں
باغ کے دَر پہ قُفل پڑا ہے
اَور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں
کِسے صدا دیں
لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں
لوگ پُرانے اُجڑ چکے ہیں
نابینا قانون وطن میں جاری ہے
آنکھیں رکھنا
جرمِ قبیح ہے
قابلِ دست اندازی حاکمِ اعلیٰ ہے!
حبس بہت ہے!



بہت دِل چاہتا ہے

بہت دل چاہتا ہے
کسی دِن غاصبوں کے نام لکھوں ایک کُھلا خط
لکھوں اس میں
کہ تم نے چور دروازے سے آ کر
مرے گھر کا تقدس

جس طرح پامال کر کے
توشہ خانے کو تصرف میں لیا ہے
تمہاری تربیت میں، یہ رویہ
دشمنوں کے ساتھ بھی زیبا نہیں تھا!
کلامِ فتح میں بھی
یہ سخن شامل نہیں تھا!
یہاں تک بھی غنیمت تھا،
تمہارے در پیش رَو، بخت آزمائی میں
زر و سیم و جواہر تک نظر محدود رکھتے تھے
جوانوں کو تہہ تلوار کرتے
مگر ماؤں کی چادر
بیٹیوں کی مسکراہٹ
اور بچوں کے کھلونوں سے
تعرّض کچھ نہ کرتے
مگر تم نے تو حد کر دی
نہ بیت المال ہی چھوڑا
نہ بیوہ کی جمع پونجی
اور اب تم نے
ہماری سوچ کو بھی
راجدھانی کا کوئی حصہ بنانے کا ارادہ کر لیا ہے
ہمارے خواب کی عصمت پہ نظریں ہیں!
قلم کا چھیننا
آساں نہیں ہے!
یہ درویشوں کی بستی ہے
دبے پاؤں بھی یاں آنے کی تم جراَت نہیں کرنا

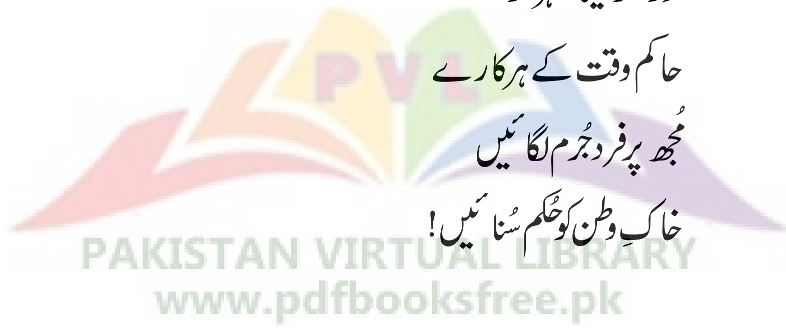
کرائے پر
قصیدہ خواں بھی اگر کچھ مل جائیں تو
قبیلے کے کسی سردار کی بیعت نہیں ملنی
ہمارے آخری ساتھی کی تکمیلِ شہادت تک
تمہیں نصرت نہیں ملنی!



چیلنج

حاکمِ شہر کے ہرکارے نے
آدھی رات کے سناٹے میں
میرے گھر کے دروازے پر
دستک دی ہے
اور فرمان سنایا ہے
''آج کے بعد سے
ملک سے باہر جانے کے سب رستے' خود پر بند سمجھنا
تم نے غلط نظمیں لِکھی ہیں''
اے۔ایس۔آئی سے کیا شکوہ
اُس نے اپنا ذہن کرائے پہ دے رکھا ہے
وہ کیا جانے
مٹی کی خوشبو کیا ہے
ارضِ وطن کے رُخ سے بڑھ کر

آنکھوں کی راحت کیا ہے
حاکمِ وقت کی نظروں میں
میری وفاداری مشکوک ہی ٹھہری تو
مجھ کو کچھ پروا نہیں
جس مٹی نے مجھ کو جنم دیا ہے
میرے اندر شعر کے پُھول کِھلائے ہیں
وُہ اس خوشبو سے واقف ہے
اس کو خبر ہے
فصلِ خزاں کو فصلِ خزاں کہنے کا مطلب
گلشن سے غداری نہیں ہے
اور اگر ایسا ٹھہرا تو
حاکم وقت کے ہرکارے
مُجھ پر فردِ جُرم لگائیں
خاکِ وطن کو حُکم سُنائیں!





۶ ستمبر ۱۹۸۷ کے لئے ایک دُعا

اے خدا!
میرے پیارے سپاہی کی تلوار میں زنگ لگنے لگا ہے
اذانوں سے پہلے جو بیدار ہوتے تھے
اب دن چڑھے تک
چھپر کھٹ سے نیچے اُترتے نہیں

دُھوپ اگر سخت ہو جائے

بارش ذرا تیز ہو جائے تو

یہ جواں سال

گھر سے نِکلتے نہیں

سرحدوں کے نگہباں اَب کرسیوں کے طلبگار ہیں

اپنے آقا کے دربار میں

جنبشِ چشم و ابرو کی پیہم تلاوت میں مصروف ہیں

سر خمیدہ ہیں

شانے بھی آگے کو نکلے ہوئے

بس نصابِ تملّق کی تکمیل میں منہمک!



میرا دل رو پڑا ہے

اے خُدا

میرے پیارے وطن پر یہ کسی گھڑی ہے

تراشے ہُوئے جسم

آسائشوں میں پڑے

اپنی رعنائیاں کھو رہے ہیں

ذہن کی ساری یکسوئی مفقود ہے

اہلِ طبل و علم

اہلِ جاہ و حشم بن رہے ہیں

اور اِس بات پر

دیکھتی ہُوں کہ مغرور ہیں!

اے خدا!

میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا
عشقِ اموال و حُبِ مناصب سے باہر نکال
اس کے ہاتھوں میں
بُھولی ہوئی تیغ پھر سے تھما!



صیّاد تو امکانِ سفر کاٹ رہا ہے
اندر سے بھی کوئی مرے پَر کاٹ رہا ہے

اَے چادرِ منصب ' ترا شوقِ گُلِ تازہ
شاعر کا ترے دستِ ہنر کاٹ رہا ہے

جس دن سے شمار اپنا پنہ گیروں میں ٹھہرا
اُس دن سے تو لگتا ہے کہ گھر کاٹ رہا ہے

کس شخص کا دِل میں نے دُکھایا تھا کہ اَب تک
وہ میری دعاؤں کا اثر کاٹ رہا ہے

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھائے
دستار کے ہوتے ہوئے سَر کاٹ رہا ہے



اگرچہ تُجھ سے بہت اختلاف بھی نہ ہوا
مگر یہ دل تری جانب سے صاف بھی نہ ہوا

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مُجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

عجب تھا جرم محبت کہ جس پہ دل نے مرے
سزا بھی پائی نہیں اور معاف بھی نہ ہوا

ملامتوں میں کہاں سانس لے سکیں گے وہ لوگ
کہ جن سے کوئے جفا کا طواف بھی نہ ہوا

عجب نہیں ہے کہ دل پر جمی ملی کائی
بہت دنوں سے تو یہ حوض صاف بھی نہ ہوا

ہوائے دہر ! ہمیں کِس لئے بجھاتی ہے
ہمیں تو تُجھ سے کبھی اختلاف بھی نہ ہوا

☆

رستے میں مل گیا تو شریک سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اُسے اپنا گھر نہ جان

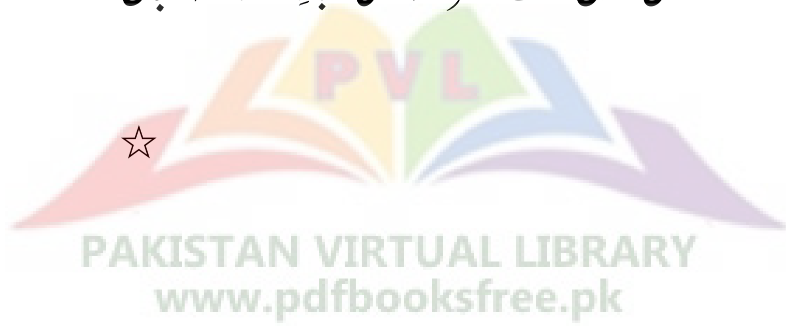
تنہا ہوں اس لئے نہیں جنگل سے بھی مفر
اے میرے خوش گماں مجھے اتنا نڈر نہ جان

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ!
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

یاں اِک محل تھا آگے زر وسیم سے بنا
اے خوش خرام! دل کو ہمارے کھنڈر نہ جان

دُکھ سے بھری ہے لیک میّسر تو ہے حیات
اس رنج کے سفر کو بھی بارِ دگر نہ جان

☆



اِسی میں خوش ہُوں مرا دُکھ کوئی تو سہتا ہے
چلی چلوں گی جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اَے دوست
قریب میں کوئی دَریا ضُرور بہتا ہے

گھنے درختوں کے گرنے پہ ماسوائے ہوا!
عذابِ دَر بَدری اور کون سہتاہے

نجانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہوجائے

دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے

مقامِ دل کہیں آبادیوں سے ہے باہر
اور اس مکان میں جیسے کہ کوئی رہتا ہے

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی!
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے



ثنائے انجم و تسبیحِ کہکشاں کیلیۓ
یہ وہ زمیں ہے بنی تھی جو آسماں کیلیۓ

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا چل پڑے کہاں کیلیۓ

ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا
بچائے رکھنا ہے کوئی دیا مکاں کیلیۓ

فضا میں دُھند بہت بڑھ گئی ہے جب کوئی چشم
ستارہ بننے لگی میرے بادباں کیلیۓ

شرارِ برق نہ زحمت کرے توجہ کی
بہت سی آگ میسّر ہے آشیاں کیلیۓ

سفید پوشیِ دیوار و در نہ کُھل جائے
بُجھائے دیئے ہیں چراغ اب تو مہماں کیلئے

فسانہ اپنا کسی اور باب میں ہے رقم
ہے انتخاب کسی اور داستاں کیلئے

ہوا پہ لکّھا ہوا حرف ہی سہی دنیا
تمام رنگ اِسی نقشِ رائیگاں کیلئے



کچھ دیر میں تجھ سے کٹ گئی تھی
محور سے زمین ہٹ گئی تھی

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمّل
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی تھی

شاید کہ ہمیں سنوار دیتی
جو شب آ کر پلٹ گئی تھی

رستہ تھا وہی پہ بن تمہارے
میں گرد میں کیسی اَٹ گئی تھی

پَت جھڑ کی گھڑی تھی اور شجر سے
اِک بیل عجب لپٹ گئی تھی



یوں وحشتِ رخصت میں نہ اِس دل کو رکھا جائے
جانا ہے کسی کو تو اچانک ہی چلا جائے

پَیوند کہاں تک لگیں اَب خرقۂ غم کو
اس پوشش رُسوائی کو تبدیل کیا جائے

اِک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مُجھ پر
تن ہے کہ اُلجھتا رہے، سر ہے کہ کُھلا جائے

سب کیلئے جاری ہے تو اے حُسنِ جہانگیر
اس بار غریبوں سے بھی انصاف کیا جائے

ہیں سرخ قبا اتنے کہ مشکل میں صبا ہے
تزئین گلستاں کے لئے کس کو چُنا جائے

سمجھوتہ ہے تو اشکِ ندامت سے رقم ہو
اعلانِ بغاوت ہے تو پھر خوں سے لکھا جائے

اے گردشِ دَوراں ترے احسان بہت ہیں
کُچھ دیر ترے ساتھ بھی اَب رقص کیا جائے



دُنیا سے بے نیاز ہوں، اپنی ہوا میں ہوں
جب تک میں تیرے دل کی محبت سرا میں ہوں

اک تخت اور میرے برابر وہ شاہ زاد
لگتا ہے آج رات میں شہرِ سبا میں ہوں

خوشبو کو رقص کرتے ہُوئے دیکھنے لگی
سحرِ بہار میں کہ طلسمِ صبا میں ہوں

ورنہ غبارِ ماہ بھی کب مُجھ کو چھوسکا
آہستہ رو ہوئی ہوں کہ شہرِ نوا میں ہوں

جیسے کوئی عقاب سے بلاتا ہے باربار
بچپن سے اِک عجیب سرابِ صدا میں ہوں

اس دل کو جب سے غم کی ضمانت میں دے دیا
اُس وقت سے کسی کے حصارِ دُعا میں ہوں



تازہ محبتوں کا نشہ جسم و جاں میں ہے
پھر موسمِ بہار مرے گلستاں میں ہے

اِک خواب ہے کہ بارِ دگر دیکھتے ہیں ہم
اِک آشنا سی روشنی سارے مکاں میں ہے

تابشِ میں اپنی مہرو نجم سے سوا
جگنو سی یہ زمیں جو کفِ آسماں میں ہے

اِک شاخ یاسمین تھی کل تک خزاں اثر
اور آج سارا باغ اُسی کی اماں میں ہے

خوشبو کو ترک کر کے نہ لائے چمن میں رنگ
اتنی تو سُوجھ بوجھ مرے باغباں میں ہے

لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی
سالارِ فوج اور کسی امتحاں میں ہے

ہر جاں نثار یاد دہانی میں منہمک
نیکی کا ہر حساب دلِ دوستاں میں ہے

حیرت سے دیکھتا ہے سمندر مری طرف
کشتی میں کوئی بات ہے یا بادباں میں ہے

اُس کا بھی دھیان جشن کی شب اے سیاہِ دوست

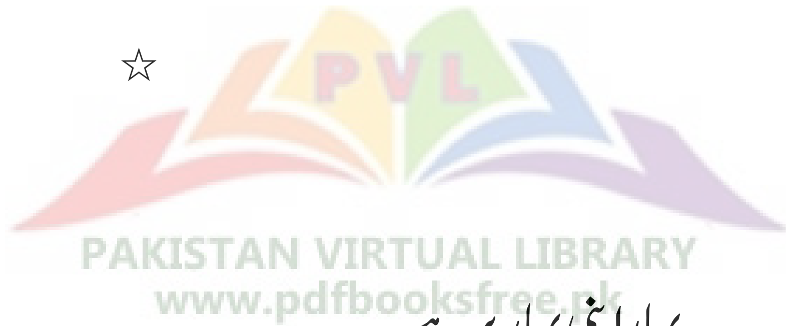
باقی ابھی جو تیر، عُدو کی کماں میں ہے

بیٹھے رہیں گے، شام تلک تیرے شیشہ گر
یہ جانتے ہُوئے کہ خسارہ دکاں میں ہے

مسند کے اتنے پاس نہ جائیں کہ پھر کُھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے

ورنہ یہ تیز دُھوپ تو چُبھتی ہمیں بھی ہے
ہم چُپ کھڑے ہُوئے ہیں کہ تُو سائباں میں ہے

☆



بہار اپنی بہار پر ہے

درخت اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں
کہیں کِسی شاخ سبز کی اوڑھنی پہ ہلکی سنہری سی گوٹ لگ رہی ہے
کہیں کسی زرد رنگ پتّی کا حاشیہ سرخ ہو رہا ہے
کہیں قبائے شجر گلابی سی ہوگئی ہے
کہیں ہرے پیڑ زرد، نارنج چادریں اوڑھنے لگے ہیں
کہیں فقط قرمزی سی اک روشنی درختوں پہ اپنا ہالہ کئے ہوئے ہے
کہیں پہ کنجِ چمن شہابی دِلوں کی لَو سے دمک اُٹھا ہے
کہیں پہ جیسے زمرّ دیں شاخسار پر لعل کِھل اُٹھے ہیں
فضا میں یاقوت بہہ رہا ہے
ہوا کے رخسار سرخ ہونے لگے ہیں

اِک خوشگوار ٹھنڈک نے شہر کو بازوؤں میں اپنے سمیٹ کر

خوش دِلی سے یوں پیار کر لیا ہے

کہ صبح گلنار ہو گئی ہے!

تمام پیڑوں کے ہاتھ سے پھول گر چکے ہیں

پر ایسا لگتا ہے

جیسے رنگ میں آ گیا رنگ ریز کوئی

بڑی مہارت سے

ایک اک پیڑ کی قبا رنگنے میں مصروف ہو گیا ہے

کہیں پہ شبنم کی آب ہے

اور کہیں پہ ابرق ہے دُھوپ کی

جس کی روشنی میں

مرا چمن جھلملا رہا ہے

خزاں کا چہرہ نکھار پر ہے

اک اور منظر کے رنگ و بُو کی

بہار اپنی بہار پر ہے!



شہزادی کا المیہ

محل کے نیچے

ہجوم عُشاق منتظر ہے

کہ خواب گہ کا حریری پردہ ذرا ہٹے تو

سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں

اور یہ کہنے کا موقع پائیں

کہ عُلیا حضرت!
ہمیں بھی پہچانیئے
کہ ہم نے
خزاں کی رُت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شامِ بے وارثی اترنے کی ساعتِ بے لحاظ میں
دودمانِ عالی جناب کو چادرِ عزا نذر کی تھی
جن کے کناروں پر تارِ خوں سے اب تک
ہمارے ناموں کے حرفِ اوّل کشیدہ ہوں گے
جو خامشی سے، کُھلے سروں اور ننگے قدموں سے
پارۂ نان و جُرعۂ آب لے کے
اُس شام سمتِ مقتل گئی تھیں
وہ عورتیں ہمارے نکاح میں تھیں
سوادِ شہرِ صبا میں
خوشبو کی واپسی کیلیئے
وہ ہم تھے
جو مثلِ خاشاک دَربدر تھے
شمالی یورپ کے دُور افتادہ یخ کدے میں
تمام تر مرکزی نظامِ حرارت و نور و نغمگی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھر بار، اپنی املاک، اپنے پیشوں سے دُور ہو کر
نئے وسیلوں سے رِزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینوچ پہ کرتے رہے گزارا

(یہ کارِ غالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے).

جو لوگ گمنام و سادہ دل تھے

سرشتِ موسم نہیں سمجھتے تھے

اور پیچھے وطن میں رہ کر

ہمارے حِصّے کے دن

عقوبت کدوں میں تنہا گزارنے

اور ہمارے حصے کے کوڑے بھی

نوش جان کرنے میں منہمک تھے

(شراکت کار بھی تو کوئی اصول ٹھہرا)

مُباح ہوگا کہ ان کی قربانیوں کا بھی کچھ حساب ہو جائے

اور عطا ہو

انہیں بھی

دینارِ سرخ و رہوارِ مُشک واراضیٔ سبزۂ آفرین و

کلاہِ زرتار و خلعتِ کارِ چوب و دوشالہ شاہ طوسی!

جہاں پنہ!

یہ تو دیکھئے

آپ کیلئے

ترک ہم نے کیا کچھ کیا ہے اب تک

کہیں ترقی کا ایک زینہ

کہیں عنایاتِ خُسروی کا کوئی وسیلہ

کہیں کوئی منعفت اثر رشتۂ سیاست

کہیں کوئی سیم رنگ شملہ

کہیں کوئی زرنگار طرّہ

اور ان سے بڑھ کر

وطن کی خوشبو ، وطن کی گرمی!

ہمارے ایثار کے تناسب سے
اب صِلے کی نوید پہنچے
کسی دیارِ غزال چشماں و گل عذاراں میں ہم کو تفویض ہو مفارت
مناصب و مال و فصل و املاک کی وزارات
نہیں تو بابِ مشاورت ہی کُھلے کسی پر
جو یہ نہیں تو
کسی علاقے کی صُوبہ داری
کسی ریاست میں منصبِ چار دہ ہزاری
بکارِ خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں
ہمیں صِلہ دیں!

کسی طرح قُربِ تاج و دربار کی فضلیت ہمیں عطا ہو
حُضور کی بارگاہِ جود و سخا میں
حاضر جو ہونا چاہیں
تو کوئی درباں ہمیں نہ روکے
تو کوئی حاجب، مقرّب خاص تک نہ ٹوکے
غلام گردش میں مثلِ مَوجِ صبا گزرنے کی ہو اجازت!

یہ کیا کہ
ہم سے بہت کہیں بعد آنے والے تو راج رتھ میں اڑے پھریں
اور ہم فقط گردِ راہ دیکھیں!
ہمیں صلہ دیں!

عریضوں اور عرضیوں کے طوفان پنہ میں
گھری ہوئی ایک شاہزادی
کبھی کبھی سوچتی تو ہوگی
کہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کو
جو پہلے ہی دشمنوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہے
خود اپنی پیاری سپاہ سے کس طرح بچائے!



سیرِ دُنیا کرے دل، باغ کا در تو کھولے
یہ پرندہ کبھی پرواز کو پَر تو کھولے

مَیں تو، تا عمر، ترے شہر میں رُکنا چاہوں
کوئی آکر مرا اسباب سفر تو کھولے

خود بھی جنگل کو مُجھے کاٹنا آجائے
پَر وہ شہزادہ مری نیند کا در تو کھولے

پُھول کچھ تیز مہک والے بھی اِس بار کِھلیں
آکے برسات مرا زخم جگر تو کھولے

کتنی آنکھیں ہیں جو بُھولی نہیں شب پیمائی
بانوئے شہر مگر لُطف کا دَر تو کھولے



شہر کے سارے معتبر آخر اُسی طرف ہوئے
جانبِ لشکرِ عُدو، دوست بھی صف بہ صف ہوئے

جاں سے گذر گئے مگر بھید نہیں کُھلا کہ ہم
کس کی شکار گاہ تھے کس کیلئے ہدف ہوئے

مشہدِ عشق کے قریب صبح کوئی نہیں ملا
وہ بھی کہ جن کے ضامنی اہلِ قُم و نَجف ہوئے

اب تو فقط قیاس سے راہ نکالی جائے گی
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے

خانۂ بے چراغ بھی سب کی نظر میں آ گیا
تیرے قیام کے طفیل ہم بھی تو باشرف ہوئے



زندگی کی دُھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے
لاکھ دیواریں شکستہ ہوں پر اَپنا گھر تو ہے

جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا

اِک حسدِ دیوار تو ہے اِک حصارِ در تو ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کار زارِ زندگی میں میرا اِک لشکر تو ہے

کون ہے اَب تک عناصر کو بہم رکھے ہوئے
موسمِ بے چہرگی میں کوئی صورت گر تو ہے

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قِصّہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے

اِک جھلک اُس کے ارادوں کی یہاں بھی دیکھ لی
فیصلے کے باب میں گو عرصۂ محشر تو ہے

سانحہ دو نیم ہونے کا پُرانا تو نہیں!
اور دلوں میں بھی، ابھی تاریخ کا کُچھ ڈر تو ہے

ڈھونڈے گا پھر اُفق کھوئی ہوئی پرواز کا
دیکھنے میں آج یہ طائرشکستہ پر تو ہے

آسمانِ سبز گوں پر ایک تارہ ایک چاند
دسترس میں کچھ نہ ہو یہ خوشنما منظر تو ہے



ہوائے تازہ میں پھر جسم و جاں فسانے کا
دریچہ کھولیں کہ ہے وقت اُس کے آنے کا

اثر ہوا نہیں اُس پر ابھی زمانے کا
یہ خواب زاد ہے کردار کِس فسانے کا

کبھی کبھی وہ ہمیں بے سبب بھی ملتا ہے
اثر ہُوا نہیں ہے اُس پر ابھی زمانے کا

ابھی میں ایک محاذِ دگر پہ اُلجھی ہوں
چُنا ہے وقت یہ کیا مجھ کو آزمانے کا

کُچھ اِس طرح کا پُر اسرار ہے ترا لہجہ
کہ جیسے راز کُشا ہو کسی خزانے کا



دُعا یہ کی ہی نہیں تُو مِرا مقدّر ہو
ہوا کی طرح مگر سانس بھر میّسر ہو

اِسی طرح رہیں گردش میں میرے شام وسحر
تُو ہی مدام مری زندگی کا محور ہو

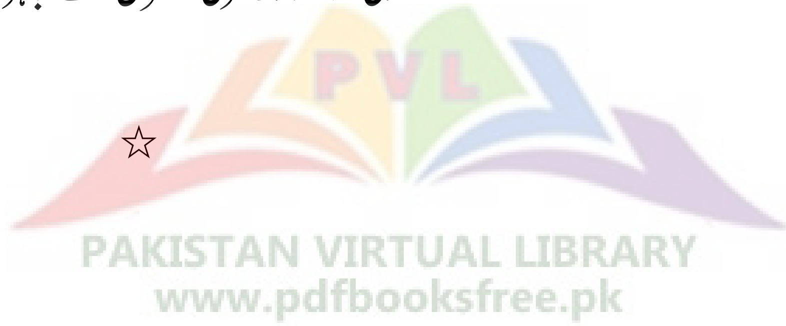
سپہرِ عمر میں جس وقت شام ہوجائے
کوئی چراغ جلانے کو گھر کے اندر ہو

کوئی بتائے کہ جشنِ بہار کیسے منائیں
اِک ایسی بیل جو صحنِ چمن کے باہر ہو

کبھی کبھی تو دلِ مضطرب یہ چاہتا ہے
کہ چاند رات ہو اور سامنے سمندر ہو

یہ دل میّسر و موجود سے بہلتا نہیں
کوئی تو ہو جو مری دسترس سے باہر ہو

☆



راہِ دشوار کی جو دُھول نہیں ہوسکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہوسکتے

تیرے معیار پہ پورے نہ اُترنے والے
منصبِ عشق سے معزول نہیں ہوسکتے

اتنا خوں ہے مرا گلشن میں کہ اب میرے خلاف
پیڑ ہوجائیں مگر پھول نہیں ہوسکتے

حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب

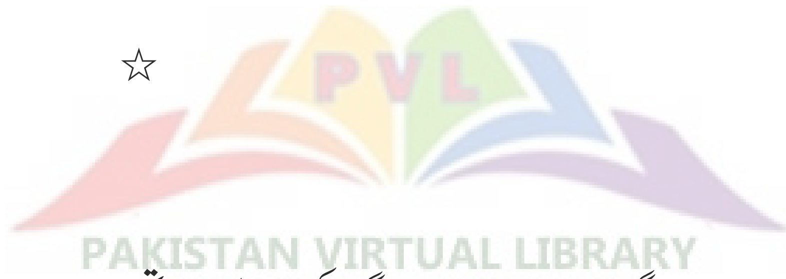
شہر کے دُکھ اُسے موصول نہیں ہوسکتے

فیصلے جن سے ہو وابستہ وطن کی قسمت
صرف اندازوں پہ محمول نہیں ہوسکتے

خُون پینے کو یہاں کوئی بلا آتی ہے
قتل تو روز کا معمول نہیں ہوسکتے

جُنبشِ اَبُروئے شاہاں نہ سمجھنے والے
کسی دَربار میں مقبول نہیں ہوسکتے

☆



زندگی بے سائباں، بے گھر کہیں ایسی نہ تھی
آسمان ایسا نہیں تھا اور زمیں ایسی نہ تھی

ہم بچھڑنے سے ہُوئے گمراہ ورنہ اس سے قبل
میرا دامن تر نہ تھا تیری جبیں ایسی نہ تھی

اب جو بَدلا ہے تو اپنی رُوح تک حیراں ہوں
تیری جانب سے میں شاید بے یقیں ایسی نہ تھی

بدگمانی جب نہ تھی، تُو بھی نہیں تھا معترض
میں بھی تیری شخصیت پر نکتہ چیں ایسی نہ تھی

کیا مرے دل اور کیا آنکھوں کا حصّہ ہے مگر
چادرِ شب اس سے پہلے شبنمیں ایسی نہ تھی

کیا ہوا آئی کہ اتنے پُھول دل میں کِھل گئے
پچھلے موسم میں یہ شاخِ یاسمیں ایسی نہ تھی



ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جائے
مری طرح سے کوئی زندگی تو کر جائے

تمام عمر تاسّف میں ہی بسر ہوگی
تری طرف سے نظر بے رخی تو کر جائے

چراغِ دِل تہہِ محرابِ جاں نہ چھوڑے گی
ہوا کے ساتھ کوئی دشمنی تو کر جائے

پھر اِس کے بعد جہاں میں کہیں پناہ نہیں
ترے حُضور یہ جاں سرکشی تو کر جائے

وہ دشمنی کے بھی قابل نہ مجھ کو چھوڑ ے گا
اُس آدمی سے یہ دل دوستی تو کرجائے



ہر ذرّہ جیسے آئنہ بردوش ہوگیا
یہ کون تھا جو خاک میں روپوش ہوگیا

اس کشمکش میں ہم نے ہی کھینچا وفا سے ہاتھ
بارِ جفا سے کوئی سُبکدوش ہوگیا

اِک دل اور اُس پہ اتنا ہجومِ غم والم
اچھا ہوا کہ زُود فراموش ہوگیا

آوازِ احتجاج ہی مدہم تھی یا کہ پھر
وہ شور تھا کہ شہر گراں گوش ہوگیا

اک شخص کیا گیا کہ بھرا شہر دفعتاً
بے حوصلہ و بد دل وکم کوش ہوگیا

تُو انتخابِ رنگ میں مصروف اور ادھر
کوئی ترے جنوں میں سیہ پوش ہوگیا

اِک شخص ٹوکتا تھا بہت اہلِ شہر کو
مژدہ کہ آج رات وہ خاموش ہوگیا



حلقہ در حلقہ برائے پندو وعظ آنے لگے
تیرے کوچے میں گئے اور لوگ سمجھانے لگے

عکسِ بے منظر سے دل تسکیں سی پانے لگے
دُھوپ میں جیسے کوئی آئینہ چمکانے لگے

باغ اور ابرِ بہار اور رات اور خوشبوئے دوست
ایک خواہش سو طرح کے رنگ دکھلانے لگے

اتنی خاموشی بھی گرد و پیش میں طاری نہ ہو
دل دھڑکنے کی صدا کانوں میں صاف آنے لگے

زرد ہوتا جارہا ہے صحنِ دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دُکھ کوئی کھانے لگے

تیری دُنیا سے نِکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تُو مرے سائے سے کترانے لگے

پیش آثارِ قدیمہ رُک گئے میرے قدم
شہر کے دیوار و در کچھ جانے پہچانے لگے



دل کی بربادی کا کوئی سلسلہ پہلے سے تھا
اِس چراغِ شب پہ الطافِ ہوا پہلے سے تھا

اُس کے یوں ترکِ محبّت کا سبب ہوگا کوئی
جی نہیں یہ مانتا وہ بے وفا پہلے سے تھا

دونوں اپنی زندگی کے جھٹپٹے میں ہیں مگر
اِس طرح مِلنا مقدّر میں لکھا پہلے سے تھا

اَب تو زخمِ دل نمک خوارِ توجّہ ہے ترا
نام پر جاری ترے حرفِ دُعا پہلے سے تھا

راستہ بُھولا نہیں اَب کے پرندِ خوش خبر
اَور کچھ اُجڑا ہُوا شہرِ سبا پہلے سے تھا

تیرے آنے سے تو بس زنجیر ہی بدلی گئی
ہم اسیروں پر جفا کا باب وا پہلے سے تھا



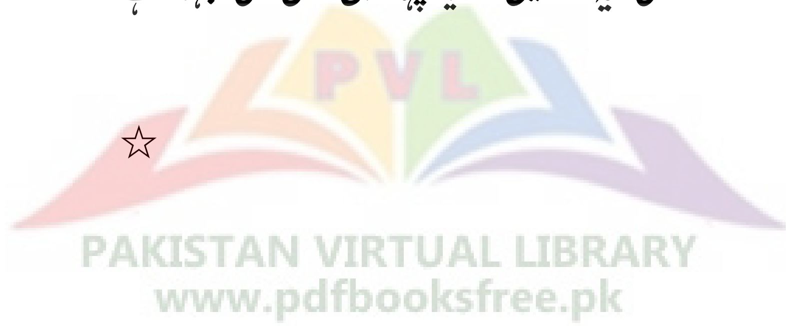
اُسی دِن گھر نہیں آتا کہ جَب آنے کو کہتا ہے
مگر کیا رُوٹھنا اُس سے وہ اپنی دُھن میں رہتا ہے

مداراتِ اَلم میں وہ نہیں شِرکت کا کچھ قائل
نہ اپنے دُکھ بتاتا ہے نہ میرے رنج سہتا ہے

لبِ خاموش ، چشمِ خشک کیا سمجھائیں گے تجھکو
جو بارش دل میں ہوتی ہے جو دریا دل میں بہتا ہے

مجھے تجھ سے جُدا رکھتا ہے اور دُکھ تک نہیں ہوتا
مرے اندر تو ترے جیسا یہ آخر کون رہتا ہے

خیالِ یار ابھی روشن، ابھی نظروں سے اوجھل ہے
ابھی یہ ریشمیں دریا پہاڑوں میں ہی بہتا ہے



☆

چارہ سازوں کی اذیّت نہیں دیکھی جاتی
تیرے بیمار کی حالت نہیں دیکھی جاتی

دینے والے کی مشیّت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

دن بہل جاتا ہے لیکن ترے دیوانوں کی
شام ہوتی ہے تو وحشت نہیں دیکھی جاتی

تمکنت سے تجھے رخصت تو کیا ہے لیکن

ہم سے اِن آنکھوں کی حسرت نہیں دیکھی جاتی

کون اُترا ہے یہ آفاق کی پہنائی میں
آئینہ خانے کی حیرت نہیں دیکھی جاتی



جُز غبارِ راہ کچھ پیش نظر رکھا نہیں
ہم نے اپنے ساتھ اسبابِ سفر رکھّا نہیں

ایک کُوزہ ، اِک عَصا ، اِک خرقۂ رِگل کے سوا
ہم فقیروں نے کسی نعمت کو گھر رکھا نہیں

ایک بار اُس نے مرے عیبوں پہ پردہ رکھ لیا
اس رعایت کو مگر بارِ دگر رکھا نہیں

رات تھے گھر پر چراغ اور عطر اُس کے منتظر
پاؤں تک لیکن ہوا نے بام پر رکھّا نہیں

جنگلوں میں شام اُتری ، خون میں ذاتِ قدیم
دل نے اُس کے بعد انہونی کا ڈر رکھا نہیں



پہنچے جو سرِ عرش تو نادار بہت تھے
دُنیا کی محبت میں گرفتار بہت تھے

گھر ڈُوب گیا اور اُنہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اُس پار بہت تھے

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوارِ گرانے کو رضاکار بہت تھے

گھر تیرا دکھائی تو دیا دُور سے لیکن
رستے تری بستی کے پُراسرار بہت تھے

ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر کہتے رہے ہم
جس شہر میں نوحے پسِ دیوار بہت تھے

یہ بے رُخی اک روز تو مقسوم تھی اپنی
ہم تیری توجّہ کے طلبگار بہت تھے

آسائشِ دُنیا کا فسوں اپنی جگہ ہے
اس سُکھ میں مگر روح کے آزار بہت تھے



وقت ہوتا کہ مرا بخت عناں گیر' سو ہے
تُجھ سے ملنے میں یونہی ہونی تھی تاخیر' سو ہے

ہم ہی اِس بار تپِ غم سے نہ بچنے پائے
وہ جو ہوتی تھی ترے ہاتھ میں تاثیر' سو ہے

اتنی دشوار نہیں تھی گرہِ غم کی کشود
بے ہنر ہی تھا مرا ناخنِ تدبیر سو ہے

رَم بہت تجھ میں ہے لیکن مرے خوابوں کے غزال
دل کو ہونا تھا ترے پاؤں کی زنجیر' سو ہے

میں ستاروں کی سفارش بھی اگر لے آتی
یہی لِکھّی تھی مرے خوابوں کی تعبیر' سو ہے



موجۂ گُل کو ہم آواز نہیں کرسکتے
دِن ترے نام سے آغاز نہیں کرسکتے

اس چمن زار میں ہم کو سبزۂ بیگانہ سہی
آپ کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے

عشق کرنا ہے تو پھر سارا اثاثہ لائیں

اس میں تو کچھ بھی پس انداز نہیں کرسکتے

دُکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے
اور مداوا ترے الفاظ نہیں کرسکتے

عشق میں یہ بھی کُھلا ہے کہ اُٹھانا غم کا
کارِ دشوار ہے اور بعض نہیں کرسکتے



..........لیکن بڑی دیر ہوچکی تھی

اِک عُمر کے بعد اس کو دیکھا!
آنکھوں میں سوال تھے ہزاروں
ہونٹوں پہ مگر وہی تبّسم!
چہرے پہ لِکھی ہوئی اُداسی
لہجے میں مگر بلا کا ٹھہراؤ
آواز میں گونجتی جُدائی
بانہیں تھیں مگر وصال ساماں!

سمٹی ہوئی اس کے بازوؤں میں
تا دیر میں سوچتی رہی تھی
کس ابرِ گریز پا کی خاطر
میں کیسے شجر سے کٹ گئی تھی
کس چھاؤں کو ترک کردیا تھا

میں اُس کے گلے لگی ہوئی تھی
وہ پُونچھ رہا تھا مرے آنسو
لیکن بڑی دیر ہو چکی تھی!



GOOD TO SEE YOU

بہت دنوں کے بعد اُسے
اک محفل میں دیکھا تھا
اک لمحے کو ہجر و وصال کے سارے موسم
آنکھوں میں لہرا سے گئے
دل میں چراغ سے جل اُٹھے
اس سے گلے ملنے کے تصوّر سے ہی
جیسے سارا وجود
پُھول کی صورت کِھل اُٹھا
اُن ہاتھوں کے لمس کو سوچ کے
سارا جسم سُلگ اٹھا
اُن ہونٹوں کی گرم گلابی نرمی کا خوش رنگ خیال
ہونٹوں پہ مسکا اُٹھا!

حلقۂ یاراں سے آخر
میری طرف وہ بھی آیا بھی
میری جانب دیکھا بھی
پر جو کہا تو اتنا کہا

آپ سے مِل کر خوشی ہوئی
میرے صحنِ دل میں اچانک ہونے والی
پت جھڑ سے یکسر لاعلم!



ایک منظر

کچا سا اِک مکاں ' کہیں آبادیوں سے دُور
چھوٹا سا ایک حُجرہ ' فرازِ مکان پر
سبزے سے جھانکتی ہُوئی کھپریل والی چھت
دیوار چوب پر کوئی موسم کی سبز بیل
اُتری ہوئی پہاڑ پہ برسات کی وہ رات
کمرے میں لالٹین کی ہلکی سی روشنی
وادی میں گھومتا ہوا اک چشمہ شریر
کھڑکی کو چُومتا ہوا بارش کا جلترنگ
سانسوں میں گونجتا ہوا اک اَن کہی کا بھید!



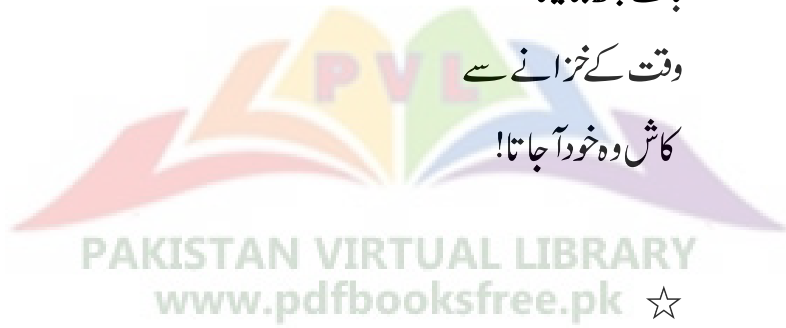
اُس نے پھُول بھیجے ہیں

اُس نے پھُول بھیجے ہیں
پھر مری عیادت کو
ایک ایک پتی میں

اُن جمیل ہاتھوں کی
خوشگوار حدّت ہے
اُن لطیف سانسوں کی
دلنواز خوشبو ہے

دِل میں پھول کِھلتے ہیں
رُوح میں چراغاں ہے
زندگی معطّر ہے!

پھر بھی دِل یہ کہتا ہے
بات کچھ بنا لیتا
وقت کے خزانے سے
کاش وہ خود آ جاتا!



☆

HOT LINE

اُس کو مجھ سے کِتنا گِلہ تھا
"میرے اور تمہارے بیچ
اتنے لوگ آ جاتے ہیں
بات نہیں ہو سکتی ہے

موسم کی پہلی بارش میں
رُت کی پہلی برفوں میں
پُورے چاند کی راتوں میں

شام کی مدّھم خوشبو میں

صبح کی نیلی ٹھنڈک میں

کتنا بے بس ہوتا ہوں

دِل کتنا دُکھ جاتا ہے!"

آج مرے اور اس کے بیچ

کوئی تیسرا فرد نہیں ہے

ہاتھ کی اِک ہلکی جنبش سے

مجھ سے رابطہ ہو سکتا ہے

لیکن وہ آواز سُنے

کِتنے موسم بیت گئے

میرے لئے بھی اُس کو بلانا

اِتنا مشکل نہیں رہا

لیکن سچی بات یہ ہے کہ

لہجوں اور آوازوں کے

ویسے رنگ نہیں ہیں اب

دُھن تو وہی ہے لیکن دِل

ہم آہنگ نہیں ہیں اب!



VANITY THE NAMEM IS.......

بہت سادہ ہے وہ

اور اُس کی دُنیا، میری دُنیا سے سراسر مختلف ہے

الگ ہیں خواب اُس کے
زندگی میں اُس کی ترجیحات ہی کچھ اور لگتی ہیں
بہت کم بولتا ہے
مجھے اُس نے لکھا ہے
صبح
میں نے لان میں کچھ خوبصورت پھول دیکھے
مجھے بے ساختہ یاد آ گئیں تم!

مجھے معلوم ہے
میں عمر کے اُس ملگجے حصّے میں ہوں
جب میرا چہرہ
کسی بھی پُھول سے قربت نہیں رکھتا
مگر جی چاہتا ہے
اس کی باتوں پر
ذرا سی دیر کو ایمان لے آؤں!



دِل کو مہرومہ و انجم کے قریں رکھنا ہے
اِس مسافر کو مگر خاک نشیں رکھنا ہے

سہہ لیا بوجھ بہت کوزہ چوب و گل کا
اب یہ اسباب سفر ہم کو کہیں رکھنا ہے

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اِس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے



جب کبھی خوبیِ قسمت سے تجھے دیکھتے ہیں
آئینہ خانے کی حیرت سے تجھے دیکھتے ہیں

وہ جو پامالِ زمانہ ہیں مرے تخت نشیں
دیکھ تو کیسی محبت سے تُجھے دیکھتے ہیں

کاسئہ دید میں بس ایک جھلک کا سکہ
ہم فقیروں کی قناعت سے تُجھے دیکھتے ہیں

تیرے کوچے میں چلے جاتے ہیں قاصد بن کر
اور اکثر اسی صُورت سے تُجھے دیکھتے ہیں

تیرے جانے کا خیال آتا ہے گھر سے جس دم
در و دیوار کی حسرت سے تجھے دیکھتے ہیں

کہہ گئی بادِ صبا آج ترے کان میں کیا
پُھول کس درجہ شرارت سے تجھے دیکھتے ہیں

تجھ کو کیا علم تجھے ہارنے والے کچھ لوگ
کس قدر سخت ندامت سے تُجھے دیکھتے ہیں



اُمید معجزہ یک نظر پہ زندہ ہیں
طبیبِ سنہر دُعا کے اثر پہ زندہ ہیں

ہم اہلِ حاجت و اربابِ احتیاج تو کیا
فقیہہ شہر بھی اب حُبّ زر پہ زندہ ہیں

یہ اور بات کہ حاکم تھے بیشتر نااہل
ہم ایسے لوگ تو صرف نظر پہ زندہ ہیں

خُدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتہ نہ چلے
کہ کچھ چراغ مرے بام و در پہ زندہ ہیں

رہِ وفا میں ابھی ہیں کچھ ایسے لوگ کہ جو
سفر سے بڑھ کے خیالِ سفر پہ زندہ ہیں

عطا ہوئی جنہیں دربار سے کبھی خلعت

خیالِ بخشش بارِ دگر پہ زندہ ہیں



گلابی پُھول دِل میں کِھل چکے تھے
ہم اس موسم میں تجھ سے مل چکے تھے

توجہ سے تری پھر کُھل رہے تھے
وگرنہ زخم تو یہ سِل چکے تھے

ستون کتنا سہارا ان کو دیتے
جو گھر بُنیاد سے ہی ہِل چکے تھے

پُرانی اجنبیت لوٹ آئی
ہم اُن سے اور وہ ہم سے مل چکے تھے

تروتازہ تھی جاں راہِ جنوں میں
اگرچہ پاؤں اپنے چِھل چکے تھے



تمھاری زندگی میں

تمھاری زندگی میں

میں کہاں پر ہوں؟
ہوائے صبح میں
یا شام کے پہلے ستارے میں
جھجکتی بوندا باندی میں
کہ بے حد تیز بارش میں
روپہلی چاندنی میں
یا کہ پھر تپتی دوپہروں میں
بہت گہرے خیالوں میں
کہ بے حد سرسری دُھن میں
تمہاری زندگی میں
میں کہاں پر ہوں؟

ہجومِ کار سے گھبرا کے
ساحل کے کنارے پر
کِسی ویک اینڈ کا وقفہ
کہ سگرٹ کے تسلسل میں
تمہاری انگلیوں کے بیچ
کوئی بے ارادہ ریشمیں فرصت؟
کہ جامِ سُرخ سے
یکسر تہی
اور پھر سے
بھر جانے کا خوش آداب لمحہ
کہ اِک خوابِ محبت ٹوٹنے
اور دُوسرا آغاز ہونے کے
کہیں مابین اک بے نام لمحے کی فراغت؟

تمہاری زندگی میں
میں کہاں پر ہوں؟



ہمارے درمیاں ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔

ہمارے درمیاں ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا
ترے شانوں پہ کوئی چھت نہیں تھی
مرے ذمے کوئی آنگن نہیں تھا
کوئی وعدہ تری زنجیر پا بننے نہیں پایا
کسی اقرار نے میری کلائی کو نہیں تھاما
ہوائے دشت کی مانند
تُو آزاد تھا
رستے تری مرضی کے تابع تھے
مجھے بھی اپنی تنہائی پہ
دیکھا جائے تو
پورا تصرّف تھا!

مگر جب آج تُو نے
راستہ بدلا
تو کچھ ایسا لگا مجھ کو
کہ جیسے تُو نے مُجھ سے بے وفائی کی!



نیاگرہ فالز

فرازِ کوہ سے گرتی ہوئی سیّال چاندی
نگارِ زندگی کا خوابِ سیمیں
طلسم آب میں عکسِ سپہر لاجوردی دم بخود ہے
فسونِ رنگ میں ڈوبی زمینِ آبنوسی ہفت پیکر ہوگئی ہے
خمِ محرابِ کوہِ ارغوانی پر
روپہلی مسکراہٹ ہے
ستارہ دار جیسے
قوسِ آبِ نیلمیں کے گرد چکر کاٹتی ہیں
عجب آواز ہے یہ
عجب قوت سے یہ اپنی طرف مجھ کو بلاتے ہیں
لہو میں رقص کرتی جا رہی ہے وحشت پیہم
دریں وحشت بطرزِ آہوئے دیوانہ می رقصم
کہ آب آتش شُد و من صُورتِ پروانہ می رقصم



ویسٹ منسٹر ایبے

قدم نہیں اُٹھتے ہیں
جانے کس کے سر پہ

کس کے دل پر
پاؤں پڑ جائے
یہاں اس ٹھنڈے فرش کے نیچے
گرمیٔ خواب سے جلنے والی
کتنی آنکھیں خوابیدہ ہیں
کتنے کشیدہ سر اب کیسے خمیدہ ہیں
وہ جو دنیاوی فرہنگ میں
خوش طالع کہلاتے تھے
جن کے بخت کا تارہ
وقت کے ماتھے پر کچھ ایسے چمکا
جیسے کبھی غروب نہ ہوگا
جن کی فکر نے
ایک ہجوم کا دھارا موڑا تھا
کوئی وقت، کوئی حرکت اور کوئی مقام سے آگے تھا
دو تثلیثوں کا ٹکراؤ!
عزتِ نفس کا پرچم آ کر کیسی ہوا میں لہرایا تھا
خاموشی کی اک اپنی آواز ہے لیکن
حد سے بڑھے تو
سنّاٹا بھی بول اُٹھتا ہے!
گرجا کے اس سحر زدہ سے نیم دھندلکے میں
دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں زندہ لگتی ہیں
خندۂ استہزا سے مجھ کو دیکھتی ہیں
لڑکی! تو کس زعم میں ہے
شعر تو ہم بھی لکھتے ہیں
ہم بھی آگ سے خاک ہوئے

کل تُو بھی مٹّی میں مٹّی ہو جائے گی
لیکن ہم میں اور تُجھ میں اک فرق رہے گا
تیرے نام کا تارہ بھی
تیری طرح بُجھ جائے گا!



جانے کب تک رہے یہی ترتیب
دو ستارے کِھلے قریب قریب

چاند کی روشنی سے اس نے لکھی
میرے ماتھے پہ ایک بات عجیب

میں ہمیشہ سے اُس کے سامنے تھی
اُس نے دیکھا نہیں تو میرا نصیب

رُوح تک جس کی آنچ آتی ہے
کون یہ شعلہ رُو ہے دل کے قریب

چاند کے پاس کیا کِھلا تارہ
بن گیا سارا آسمان رقیب

شجرۂ اہلِ درد کس سے ملے
شہر میں کون رہ گیا ہے نجیب



آنکھوں کے لئے جشن کا پیغام تو آیا
تاخیر سے ہی چاند لبِ بام تو آیا

اُس باغ میں اِک پُھول کھلا میرے لئے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

پت جھڑ کا زمانہ تھا تو یہ بخت ہمارا
سیرِ چمن کو وُہ گلفام تو آیا

اُڑ جائیگا پھر اپنی ہواؤں میں تو کیا غم
وُہ طائرِ خوش رنگ تہہِ دم تو آیا

ہر چند کہ کم عرصۂ زیبائی میں ٹھہرا
ہر چہرہ گل باغ کے کُچھ کام تو آیا

جب دُور تھے ہم نظمِ گلستاں سے تو خوش تھے
تحسین بھی جاتی رہی ' انعام تو آیا

واضح تو ہوا ترکِ محبت کا ارادہ
بارے دِلِ آشفتہ کو آرام تو آیا

شب سے بھی گزر جائیں گے گر تیری رضا

دورانِ سفر مرحلہ شام تو آیا



جو صبح خواب ہوا ' شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اُس سے مرا دل اُداس کتنا تھا

وہ اور شے تھی قبا جس سے ہوگئی رنگیں
اُسے پتہ ہے کوئی خوش لباس کتنا تھا

خبر نہیں کہ تجھے دیکھنے میں آنکھوں کا !
یقین کِتنا رہا ' التباس کتنا تھا

بغیر دیکھے ہی لوٹا دیے جو پھول آئے
کسی کے حق میں یہ دل ناسپاس کتنا تھا

وہ جس کو بزم میں مہمانِ عام بھی نہ کہا
کسے بتائیں کہ خلوت میں خاص کِتنا تھا



دِل کی حالت ہے اِضطرابی پھر
کوئی لائے گا یہ خرابی پھر

ایک مدّت کے بعد خوابوں کا
پیرہن ہوگیا گلابی پھر

لے رہی ہے طویل رات کے بعد
زندگی غسلِ آفتابی پھر

دھیان کی رحل پہ بصَد مفہُوم
ایک چہرہ کُھلا کتابی پھر

کٹ ہی جائے گی شب کہ آنکھوں میں
ایک صُورت ہے ماہتابی پھر

چُھو رہی ہے ہوا مستانی
شجرِ جاں ہوا شہابی پھر

گر رہے ہیں ترے خیال کے پُھول
خوبصورت ہے فرشِ خوابی پھر

شرحِ آسودگی میں حائل ہے
معنیٔ غم کی دیریابی پھر



سفرِ خواب

بہت ہی خوبصُورت خواب تھا
جو کچّی عمروں میں
میں اکثر دیکھتی تھی

یہ کہ

پُورے چاند کی شب ہے
زمیں سے آسماں تک
روشنی کی ایک سیڑھی بن گئی ہے
مرے تن پر ستاروں سے بنا ملبوس ہے
اک ہاتھ میں تازہ گلاب
اَور دُوسرے میں تیرا بازو ہے
میں تیرا ہاتھ تھامے
زینہ در زینہ قدم رکھتی ہوں
نامعلوم دُنیا کے سفر پر ہوں
تری سانسوں کی خوشبو
رات کی رانی کا جادو
چاندنی کا لمس
آپس میں گُھلے جاتے ہیں
میری رُوح میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں!

یہ سپنا جل چکا تھا
بس اس کی راکھ میری روح میں اکثر اڑا کرتی
مگر کل شب
شبِ مہتاب تھی
اور آسماں تک نُور کی سیڑھی بنی تھی
ستاروں سے بھرا آنچل تھا میرا

مرے اک ہاتھ میں ہلکے گلابی پُھول تھے
اور دُوسرا اک اجنبی کے ہاتھ میں تھا
جس کا ہر انداز تجھ سے مختلف تھا
مگر اُس آنکھ میں جو جگمگاہٹ تھی
مری دیکھی ہُوئی تھی
اور اُس لب پر جو دلکش مسکراہٹ تھی
مری چُومی ہوئی تھی!



ایک شریر نظم

جشنِ بہار تھا

بارش فرشِ گل پہ مسلسل ناچ رہی تھی
ہوا کی لَے تھی بے حد شوخ
پیڑ خوشی سے جُھوم رہے تھے
ساری فضا پتوں کی ہنسی سے گونج رہی تھی!

صحنِ چمن کے گوشے میں
میں بھی کھڑی تھی تیرے ساتھ
رُوح کا دامن کھینچ رہی تھی
تیرے پیراہن کی آنچ
میرے اور بارش کے لبوں پر
کھیل رہی تھی
ایک ہی بات
تیرے ہونٹ‘ تری پیشانی‘ ترے ہاتھ‘



وہ باغ میں میرا منتظر تھا

وہ باغ میں میرا منتظر تھا
اور چاند طلوع ہو رہا تھا
زُلفِ شبِ وصل کُھل رہی تھی
خوشبو سانسوں میں گُھل رہی تھی
آئی تھی میں اپنے پی سے ملنے
جیسے کوئی گُل ہوا سے کِھلنے
اِک عُمر کے بعد میں ہنسی تھی
خود پر کتنی توجہ دی تھی!

پہنا گہرا بسنتی جوڑا!
اور عطرِ سہاگ میں بسایا
آئینے میں خود کو پھر کئی بار
اُس کی نظروں سے میں نے دیکھا
صندل سے چمک رہا تھا ماتھا
چندن سے بدن دمک رہا تھا
ہونٹوں پہ بہت شریر لالی
گالوں پہ گُلال کھیلتا تھا
بالوں میں پروئے اتنے موتی
تاروں کا گمان ہو رہا تھا
افشاں کی لکیر مانگ میں تھی
کاجل آنکھوں میں ہنس رہا تھا

کانوں میں مچل رہی تھی بالی
بانہوں سے لپٹ رہا تھا گجرا
اور سارے بدن سے پُھوٹتا تھا
اس کے لئے گیت جو لِکھا تھا!

ہاتھوں میں لئے دیے کی تھالی
اُس کے قدموں میں جا کے بیٹھی
آئی تھی کہ آرتی اتاروں
سارے جیون کو دان کردُوں!

دیکھا مرے دیوتا نے مجھ کو
بعد اس کے ' ذرا مسکرایا
پھر' میرے سنہرے تھال پر ہاتھ
رکھا بھی تو اِک دیا اُٹھایا!
اور میری تمام زندگی سے
مانگی بھی ' تو ایک شام مانگی!



شجر کے ہاتھ میں اک زرد پُھول باقی ہے
ابھی لباسِ مسافر پہ دُھول باقی ہے

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی اُصول باقی ہے

درُونِ شہر گلابوں کی باڑ ختم ہُوئی
کنارِ شہر پُرانی ببُول باقی ہے

ہوائے شہرِ ستم کو ابھی پتہ نہ چلے
مرے دوپٹے میں اک سُرخ پھول باقی ہے

☆

قسمت سے بھی کچھ سِوا دیا ہے
بارش نے ہمیں مِلا دیا ہے

دیکھی ہے مری اُداسی اُس نے
اور دیکھ کے مُسکرا دیا ہے

اَب تو مجھے صبر آگیا تھا
یہ کِس نے مُجھے رُلا دیا ہے

وہ چاہے تو راستہ بدل لے
میں نے تو دِیا جلا دیا ہے

اُس رونقِ بزم نے تو میری
تنہائی کو بھی سجادِیا ہے

وہ پل کہ سلگ اٹھا ہے ملبوس
اور اس نے دِیا بُجھا دیا ہے



رُکنے کا سمے گزر گیا ہے
جانا ترا اَب ٹھہر گیا ہے

رخصت کی گھڑی گھڑی ہے سر پر
دل کوئی دونیم کر گیا ہے

ماتم کی فضا ہے شہرِ دل میں
مجھ میں کوئی شخص مرگیا ہے

بُجھنے کو ہے پھر سے چشمِ نرگس
پھر خوابِ صبا بکھر گیا ہے

بس ایک نگاہ کی تھی اس نے
سارا چہرہ نِکھر گیا ہے



بارِ احساں اٹھائے جس تِس کا
دِل اسیرِ طلب ہوا کِس کا

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

یہ دُعائے شفا ہے یا کچھ اور
اُس نے بھیجا ہے پُھول نرگس کا

ضبط اِتنا نہیں اشکوں پر
کچھ خیال آگیا تھا مجلس کا

پھر سے خیمے جلے ہیں اور سرِ شام
بین ہے اپنے اپنے وارث کا

☆

لوٹنا ہے مجھے گھر جائیگا آخر وہ بھی
میں بھی غربت میں ہوں، مانندِ مسافر وہ بھی

میں نے بھی پیاس کے صحرا میں بڑے دن کاٹے
جُرعۂ آب کو ترسا ہوا طائر وہ بھی

میرا دُکھ بھی مرے چہرے سے نہیں کُھلتا ہے

اور سرِ بزم ہے فرخندہ بظاہر وہ بھی

اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چُپ رہے گا مری ناموس کی خاطر وہ بھی

کیا عجب ہے کہ یہ دل ہوش سے بیگانہ ہوا
شب کا افسوں بھی جنوں خیز تھا ساحر وہ بھی

☆

کیا بات ہے جس کا غم بہت ہے
کچھ دِن سے یہ آنکھ نم بہت ہے

مل لیتا ہے گفتگو کی حد تک
اتنا ہی ترا کرم بہت ہے

گھر آپ ہی جگمگا اُٹھے گا
دہلیز پہ اِک قدم بہت ہے

مل جائے اگر تری رفاقت
مجھ کو تو یہی جنم بہت ہے

کیا شب سے ہمیں سوال کرنا
ہونا ترا صبح دم بہت ہے

کیوں بُجھنے لگے چراغ میرے
اب کے تو ہوا بھی کم بہت ہے

چُپ کیوں تجھے لگ گئی ہے پروینؔ
سنتے تھے کہ تجھ میں رَم بہت ہے

☆

عجب اِک ساعتِ گلفام آئی
صبا لے کر کسی کا نام آئی

کسی دل میں جزیرے کی نہ تھی چاہ
سمندر پر اک ایسی شام آئی

اداسی مُسکراتی ہے کہ اَب کہ
توجّہ سے تری خوش کام آئی

دُعا اب چاہے بامِ عرش چُھولے
ترے دَر سے تو یہ ناکام آئی

تُو سوداگر ہے ایسا ہاتھ جس کے
کِسی کی زندگی بے دام آئی

یہ ساری زندگی کی بے نیازی
بالاآخر حسن کے کیا کام آئی



رستہ ہی نیا ہے، نہ میں انجان بہت ہوں
پھر کوئے ملامت میں ہوں، نادان بہت ہوں

اک عمر جسے خواب کی مانند ہی دیکھا
چُھونے کو ملاہے تو پریشان بہت ہوں

مُجھ میں کوئی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
اک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں

دیکھا ہے گریز اُس نگہہِ سرد کا اتنا
مائل بہ توجّہ ہے تو حیران بہت ہوں

اُلجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں



فیضؔ صاحب کے لئے ایک اور نظم

عجب گھڑی ہے

ابھی تجھے سبز خانۂ خاک میں رکھے

اک پہر ہوا ہے

ابھی قبائے سخن سے

تیرے بدن کی گرمی گئی نہیں ہے

فرودگاہِ حیات میں رخصتِ سفر کی

تمام تر گرد دم بخود ہے

نشست کی جا نہیں ملی ہے

تری لحد کے گُلاب ویسے ہی تازہ رو ہیں

صبا ابھی تیری مسکراہٹ سے مشکبُو ہے!

ابھی رسمِ وداع پوری نہیں ہوئی تھی

کہ جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا ہے، ہم میں

کسی کا کہنا کہ خرقۂ فن

اُسے ترے ہاتھ سے مِلا ہے

کوئی بزعمِ خود آن کر

مسندِ خلافت پہ رونق افروز ہو گیا ہے

مجاورینِ ادب' ترے مقبرے پہ

لوبان وعوُد وعنبر جلائے بیٹھے

سخن کا نذرانہ مانگتے ہیں

اک اک غزل کہنے والے نوخیز و سبز رُو کو دکانِ شہرِ سخن کو

آ کر' بصد عنایت

بقا کی تعویذ بانٹتے ہیں

کہیں ترا نام بک رہا ہے
کہیں پہ آواز کا ہے سودا
سخن کی آڑھت عروج پر ہے!



نمائش

شہر کے بیچوں بیچ نمائش لگی ہوئی ہے
طرح طرح کے زخموں کے اسٹال لگے ہیں
کہیں بڑی محنت سے سُرخ رنگائے ہوئے دلکش ملبوس
سینت سینت کے رکھے ہُوئے تارِداماں
پھٹے ہوئے آنچل
اور مسکی اوڑھنیاں
نم آلود، شکن بستہ، میلی چادر
لوحِ پشت پہ نیلم کی نقّاشی والے جسم
حبسِ بے جا میں رکھے جانے والے کچھ خواب
گِروی رہنے والی آنکھیں
عمر قید پانے والی آشائیں
جلاوطن اُمیّد یں!

اس انبوہ رنگ میں
کچھ ایسے بھی لوگ کھڑے ہیں
جن کے دل اور لان کے پھُول
کبھی نہیں مرجھائے

جن کی نرمیٔ پیراہن کو
بادِ صبا تک چھونے سے گھبراتی ہے
جن کے بدن پر اک ہلکا سا زخم لگے تو
لالہ رُخانِ شہر کی پلکیں
بہرِ رفو آجاتی ہیں
جن کی خواب گھوں کا ریشم
سپنے بُنتا رہتا ہے
نیلم اور یاقوت یہاں پڑ اپنی جگہ پر ہوتے ہیں
خواب انہیں خود دیکھتے ہیں
عمر قید،
حبسِ بے جا
اور کالا پانی
جیسے لفظ
انکے کے لئے نامحرم ہیں!
جن کے گھروں میں
فصل کے میوے
رُت کے پھول
اور تہوار کی شیرینی
حاکمِ وقت کے توشۂ خاص سے بجھوائے جاتے ہیں
مخبرِ خاص کی خلعت پا کر
معتبرینِ شاہ میں شامل ہو کر
جو ہر صبح نکلتے تھے
زیرِ فلک نافرمانی کی سُن گُن لینے
زیرِ زمیں میں سچائی کی سرکوبی کرنے
اور ہر شام کو کافی ہاؤس میں

حاکم ناجائز کے خلاف

نیا تبرّا لکھنے اور مکرّر کہنے والے سادہ دلوں کے گھر کا پتہ

کارکنانِ سادہ قبا تک پہنچانے

چیزوں کی ترتیب اچانک بدل گئی ہے

سر چشمہ دُکھ ہے یا گلیسرین

آنسو یکساں چمک رہے ہیں!

ساری آنکھیں صف بستہ ہیں

دروازے پر لگی ہوئی ہیں

بانوئے شہر قدم رنجہ ہوں

فیتہ کاٹیں!

☆



سِندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رُسولؐ سے ایک سوال

اے دینِ کے آخری پیمبر

تھا لُطف خُدا کا خاص تجھ پر

بھیجا تھا تجھے بنا کے رحمت

ساری دُنیا کے بےکسوں پر

ہوتی رہی تجھ پہ سنگ باری

ہونٹوں سے رہیں دُعائیں جاری

ہر سود کو کردیا تھا باطل

ہر خُون معاف کردیا تھا

تلواریں نیام میں دکھا دیں

چادر میں اُٹھا کے سنگِ اسود

خوددار مسافرت کے تفسیر
عقبہ کی وہ باوقار بیعت
گھر چھوڑا کچھ اس طرح سے تُو نے
ہجرت کو مثال کر دیا تھا

انصار و مہاجرین کیا تھے
ایثار و وفا کی اِنتہا تھے
وسعت سے دِلوں کی بھر دیا تھا
تُو نے انہیں ایک کر دیا تھا!
ہم بھی ترے ہی اُمتّی ہیں
اُس لشکرِ اوّلیں کی صُورت
تُجھ سے ہی تو سِلسلہ ہے اپنا
پھر کیا ہے کہ ہم میں اور اُن میں
ہلکی سی مشابہت نہیں ہے
اب گھر ہے نہ کوئی دل کشادہ
لگتا ہے کہ ہر درخت اپنے
سایے کے خلاف ہو گیا ہے
بھائی، بھائی کو کھا رہا ہے
خاکم بدہن، پہ تیرے ہوتے
کیا ہم پہ کسی کی بددُعا ہے
بستی یہ ہماری جس میں اب بھی
خوشبُو ترے نام کی بسی ہے
بارُود میں کیوں نہا رہی ہے
شعلے اسے کیوں نگل رہے ہیں
جو شہر کہ اپنی شخصیت میں

شبنم تھا، گلاب تھا، صبا تھا
اب آگ ہے، خون ہے، دھواں ہے
یہ شہر ہے، سانحہ ہے، کیا ہے
کُوفہ ہے کہ کربلا ہے، کیا ہے



دشتِ غربت میں ہیں اَور رنجِ سفر کھینچتے ہیں
بارِ ہستی ہے جسے خاک بہ سر کھینچتے ہیں

جن چراغوں کو میّسر نہیں اس کی محفل
انتظار اُس کا سرِ راہگذر کھینچتے ہیں

زندگی پھر تجھے پیش ہے زندانِ دمشق
اشقیا پھر ترے کانوں سے گہر کھینچتے ہیں

روشِ گلُ پہ، یہ کس وضع کے صیّاد ہیں جو
باندھ کر طائرِ خوں بستہ کے پر کھینچتے ہیں

شہر سے جب بھی وہ جائے تو دُعاؤں کا حصار
دیدۂ نم مرے تاحدّ نظر کھینچتے ہیں

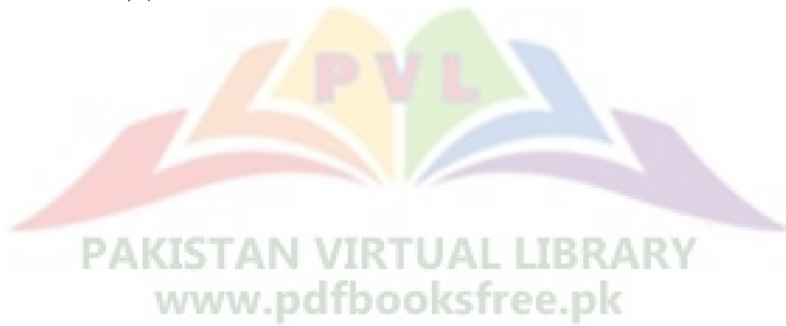
جانتے ہیں کہ شکستہ ہے طنابِ اُمیدّ
خیمۂ جاں ترے کوچے میں مگر کھینچتے ہیں

تیری خوش نامی کا آتا ہے بہت دل کو خیال
گریہ کرتے ہُوئے آواز اگر کھینچتے ہیں

لگ گئی تھی تری کچھ پچھلے پہر آنکھ اے دل
آج سے ہم ترے نالے سے اثر کھینچتے ہیں

دل کو کچھ تیری توجہ کا بھی طالب پایا
تیری توصیف سے اَدب دستِ ہنر کھینچتے ہیں





کراچی ـــــــــــ ۸۹ء کی آخری شام

عکسِ گُل تر جلا ہوا تھا
خوابوں کا نگر جَلا ہوا تھا

یا دستِ دُعا نہ اُٹھ سکا تھا
یا اُس کا اثر جَلا ہوا تھا

ہر گھر تھا لُٹا ہوا کئی بار

اور بارِ گرد جَلا ہوا تھا

یا نوچ لئے گئے تھے پتّے
یا سارا شجر جَلا ہوا تھا

آنکھوں کی جگہ پہ آبلے تھے
اور تارِ نظر جَلا ہوا تھا

ملبہ تھا تمام، شہرِ خوبی
اور ہو کے کھنڈر جَلا ہوا تھا



تہہ خانۂ جاں میں تجھ کو رکھتی
لیکن مرا گھر جَلا ہوا تھا

کچھ دیر کا سوختہ نہ تھا شہر
یہ آٹھ پہر جَلا ہوا تھا

پرواز کا اتنا ڈر قفس میں
ٹوٹا ہوا پر جَلا ہوا تھا

منزل تھی غبارِ راہ میں گُم
اور رختِ سفر جَلا ہوا تھا



جب ہو کے صبا کوچۂ تعزیر سے آئی
آواز عجب حلقۂ زنجیر سے آئی

خوشبو کا دریچہ بھی کُھلا رنگ کے ہمراہ
اک یاد بھی لپٹی ہوئی تصویر سے آئی

گُل لے گئے عطّار ، ثمر کھا گئے طائر
سُورج کی کرن باغ میں تاخیر سے آئی

پہلے بھی کشش جلوۂ دُنیا میں تھی لیکن
اس بار ترے حُسن کی تاثیر سے آئی

سادہ تھا بہت خوب ترا چشمِ تمنا
مشکل میں نظر کثرتِ تعبیر سے آئی

یوں سارے چراغ اور گلاب اپنی جگہ میں
رستے میں چمک سایہ رہگیر سے آئی



شہرِ جمال کے خس و خاشاک ہوگئے
اب آئے ہو جب آگ سے ہم خاک ہوگئے

ہم سے فروغِ خاک نہ زیبائی آب کی
کائی کی طرح تہمتِ پوشاک ہوگئے

پیراہنِ صبا تو کسی طور سِل گیا
دامانِ صد بہار مگر چاک ہوگئے

اے ابرِ خاص! ہم پہ برسنے کا اب خیال
جل کر ترے فراق میں جب راکھ ہوگئے

قائم تھے اپنے عہد پہ یہ دیدۂ ہائے غم
کیا یاد آگیا ہے کہ نمناک ہوگئے

اَب تک جنوں ہی اپنا اثاثہ رہا مگر
تُجھ سے ملے تو صاحبِ ادراک ہوگئے

خوشبو تو بن نہ پائے سو کچھ ہم سے بے ہنر
اے موجۂ صبا ترے پیچاک ہوگئے



نثری نظمیں

ندامت

میری تمام نظموں کا انتساب اب تک صرف میرے اپنے نام رہا
اور میں خود کو محبت کی شاعرہ سمجھ کر
خوش ہوتی رہی
میں نے کوڑے کے ڈھیر پر بلی کی طرح چلتا ہوا بچّہ نہیں دیکھا
میں نے اینٹ کا تکیہ بنا کر سوتا ہوا راج نہیں دیکھا
راج سے میرے ذہن میں
ہمیں راج ہنس آئے
اور بچّوں سے تازہ گلاب
میں کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی
میرے بچّے
میرے راج
ہو سکے تو مُجھے معاف کر دینا!



بشیرے کی گھر والی

ہے رے تیری کیا اوقات!
دُودھ پلانے والے جانوروں میں
اَے سب سے کم اوقات
پُرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا
تیرے پُھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے
تجھ کو کتنے کام آجاتے
اُپلے تھاپنا
لکڑی کاٹنا
گائے کی سانی بنانا
پھر بھی مکھّن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیّا کی روٹی پہ رکھی
تیرے لئے بس رات کی روٹی
رات کا سالن
روکھی سوکھی کھاتے
موٹا جھوٹا پہنتے

تجھ پہ جوانی آئی تو
تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی
تیرے اُٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے پر
ایسی کڑی نظر رکھی
جیسے ذرا سی چُوک ہوئی
اور تُو بھاگ گئی
سولھواں لگتے ہی
ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اُتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا
تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ
اب تیرے ذمے شامل تھا
روٹی کھلانے والے کو
رات گئے خوش بھی کرنا
اور ہر ساون گا بھن ہونا
پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی
پتی کا ساتھ
بس بستر تک
آگے تیرا کام!
کیسی نوکری ہے
جس میں کوئی دیہاڑی نہیں
جس میں کوئی چھٹی نہیں
جس میں الگ ہوجانے کی' سرے سے کوئی ریت نہیں
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی

جیٹھ اساڑھ کی دُھوپ میں

پیڑ تلے سستانے کی آزادی ہوتی ہے

تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں

تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے

ہے رے!

کن کرموں کا پھل ہے تُو

تن بیچے تو کسبی ٹھہرے

من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے

سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا

کب تک یہ اپمان

ایک نوالہ روٹی

ایک کٹورے پانی کی خاطر

دیتی رہے گی کب تک تُو بلیدان!



☆

ایک U.D.C کی ڈائری

میرا بچپن اپنے آپ کو لوریاں دیتے گزرا

اور جوانی

نیندوں کو خوابوں کی رشوت دیتے ہوئے

وقت ہمیشہ مجھے گالیاں دیتا رہا

اور زمانے نے بھی خوب ٹھڈّے لگائے

یہاں تک کہ رُلتے رُلاتے

میں ایک بدبُو دار کمرے میں آن پہنچا

جہاں میرے چاروں طرف
قبل مسیح فائلیں تھیں

اور حنوط کئے ہُوئے ' میرے ہی جیسے کچھ کلرک

اور ایک آدھا اپنے وجود سے شرمندہ چپراسی

ہم سارا وقت اِن فائلوں میں اپنی ناکیں دیے بیٹھے رہتے

اور افسروں کے موڈ کے مطابق

ان پر فلیگ لگاتے

خود ہم پر تو کبھی پی۔یو۔سی ٹ کی چٹ بھی نہیں لگی

شاید ہم وہ فائلیں ہیں

جنہیں خدا مارک کرنا بُھول گیا

چنانچہ ہم ساری زندگی

ایک ہی میز پر دھرے رہے

اور ہم پر بے توجہی کی گرد جمتی رہی!

میں نے ایک بار

اس میز سے کِھسکنے کی کوشش کی تھی

اور چُپکے سے

اور فائلوں کے ساتھ نتھّی ہوکر

اُوپر چلا گیا

اِتنی سی بات پر

میرے افسر کے افسر نے

اُس کی ماں بہن ایک کردی تھی

اور اُس نے منطقی طور پر ہماری

اُس دن کے بعد سے

میں اپنی اوقات کبھی نہیں بھولا

(اور نہ میرا چھوٹا افسر)

اَب میں گدھے کی سی دلجمعی سے نوٹ لکھتا ہوں

اور اس عبارت کے دوران

کبھی کبھی ٹوٹی ہوئی پیالی میں چائے پی لیتا ہوں

اور کبھی ادھار سگریٹ کا ایک کش لگا لیتا ہوں

(جو میری واحد عیّاشی ہے)

شام ڈھلے

اکڑی ہوئی ٹانگوں اور تختہ ہوتی کمر کو گھسیٹتے

بس اسٹاپ کی طرف نکل پڑتا ہوں

اور دَم گھونٹنے والی بسوں کے اندر ٹھنسے ہوئے ریوڑ کا

حِصّہ بن جاتا ہوں

شام گئے گھر پہنچتا ہوں

جہاں میری بھنکتی ہوئی بیوی میری منتظر ہے

جو بیسواؤں کیطرح

پہلے میری جیب میں ہاتھ ڈالتی ہے

پھر بچوں کو گلی سے باہر دھکیلتی ہے

رات گئے

۲۲ روپے والے ڈالر کے زمانے میں

میں اپنے ۵ روپے سالانہ اضافے کو

سوچ سوچ کر خوش ہوتا ہوں

اور انگلیوں پر

پراویڈینٹ فنڈ کا حساب کرتا ہوں

اور آنے والے بڑھاپے کو لوری دینے لگتا ہوں!



ٹماٹو کیچپ

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اِس لئے اُس کا دشمن ہو جاتا ہے!

سارا نے ان معنوں میں
دشمن کم بنائے
اس لئے کہ وہ وضاحتیں دینے میں
یقین نہیں رکھتی تھی
وہ ادیب کی جورو بننے سے قبل ہی
سب کی بھابھی بن چکی تھی
ایک سے ایک گئے گذرے لکھنے والے کا دعویٰ تھا
کہ وُہ اُس کے ساتھ سو چکی ہے
صبح سے شام تک
شہر بھر کے بے روزگار ادیب
اس پر بھنبھناتے رہتے
جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے
وہ بھی سڑی بسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں سے اوب کر
ادھر ہی آتے
(بجلی کے بل، بچّے کی فیس اور بیوی کی دَوا سے بے نیاز ہو کر
اس لئے کہ یہ مسائل

چھوٹے لوگوں کے سوچنے کے ہیں)

سارادن

ساری شام

اور رات کے کچھّ حصے تک

اَدب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی

بُھوک لگتی تو

چندہ وندہ کرکے

نکڑّ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آجاتے

عظیم دانشور

اُس سے چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہتے

تم پاکستان کی امرتا پریتم ہو

بے وقوف لڑکی

سچ سمجھ لیتی

شاید اس لئے بھی

کہ اُس کے نان ونفقہ کے ذمہ دار تو اسے ہمیشہ

کافکا کی کافی پلاتے

اور نرودا کے بسکٹ کھلاتے رہتے

اس رال میں لتھڑے ہوئے COMPLIMENT کے بہانے

اُسے روٹی تو ملتی رہی

لیکن کب تک

ایک نہ ایک دن تو اُسے بھیڑیوں کے چُنگل سے نکلنا ہی تھا

سارا نے جنگل ہی چھوڑ دیا!

جب تک وہ زندہ رہی

اَدب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے

اُن کی محفلوں میں اُس کا نام

اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اَب وہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انہوں نے اسے
ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا ہے!



اسٹیل مِلز کا ایک خصُوصی مزدُور

کالا بُھوت
جیسے کوئلے کے نطفے سے جنم لیا ہو
ایک جہنمی درجۂ حرارت پر رہتے ہوئے
اُس کا کام
دہکتی بھٹی میں کوئلے جھونکتے رہنا تھا
اُس کے بدلے
اُس کو اُجرت بھی زیادہ ملتی تھی
اور خوراک بھی خصوصی
اور ایک وقت میں چار گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا
لیکن شاید اس کو یہ نہیں معلوم
کہ خودکشی کے اس معاہدے پر
اُس نے
بقائمی ہوش وحواس دستخط کئے ہیں
اس بھٹی کا ایندھن دَراصل وہ خود ہے!



سمجھداری کی ایک نظم

باسو بہت رویا

اور مصر رہا کہ اُسے اُس کی زوجہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے

نوجوانوں نے ایک دوسرے کو

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنیاں ماریں

بوڑھوں نے اُسے خللِ دماغ کہا

اور مولوی نے بدعت

باسو بڑی مشکل سے گھر لایا گیا!

وہ روز دفتر سے سیدھا میوہ شاہ چلا جاتا

پُھولوں اور اگربتیوں کیساتھ

اُس کا کافی عرصے یہی معمول رہا

پھر جمعرات کے جمعرات

پھر ہر نوچندی کو

پھر عید بقرعید اور شب برات

آخر میں برسی کے برسی

ایک دن چلچلاتی دُھوپ میں

بس نمبر ۶۰ سے اُترتے ہوئے

اُس کی نظر ایک پیڑ پر پڑی

تو اُسے دفتر میں رکھی گئی

نئی ٹائپسٹ کا خیال آ گیا

اُس دن اُسے احساس ہوا

کہ دُنیا ایک آدمی پر مشتمل نہیں ہے

باسو بہت ہنسا



ایک مشکل سوال

ٹاٹ کے پَردوں کے پیچھے سے
ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا
وہ چہرہ
بہار کے پہلے پُھول کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفّاف!
لیکن اُس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور اُن لکیروں میں
برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی
اُس کے ہاتھ
اُس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے!



یاسر عرفاتؔ کیلئے ایک نظم

آسمان کا وہ حصہ
جسے ہم اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھتے ہیں

کتنا دلکش ہوتا ہے
زندگی پر یہ کھڑکی بھر تصرف
اپنے اندر کیسی ولایت رکھتا ہے
اس کا اندازہ
تجھ سے بڑھ کر کسے ہوگا
جس کے سر پہ ساری زندگی چھت نہیں پڑی
جس نے بارش سدا اپنے ہاتھوں پہ روکی
اور دُھوپ میں کبھی دیوار اُدھار نہیں مانگی
اور برفوں میں
بس اِک الاؤ روشن رکھا
اپنے دل کا
اور کیسا دل
جس نے ایک بار کسی سے محبت کی
اور پھر کسی اور جانب بُھولے سے نہیں دیکھا
مٹی سے اِک عہد کیا
اور آتش و آب و باد کا چہرہ بُھول گیا
ایک اکیلے خواب کی خاطر
ساری عمر کی نیندیں گروی رکھ دیں ہیں
دھرتی سے اک وعدہ کیا
اور ہستی بُھول گیا
ارضِ وطن کی کھوج میں ایسے نکلا
دل کی بستی بھول گیا
اور اس بُھول پہ
سارے خزانوں جیسے حافظے داری
ایسی بے گھری ٗ اس بے چاری کے آگے

سارے جگ کی ملکیت بھی تھوڑی ہے

آسمان کی نیلاہٹ بھی میلی ہے!



دوست مُلک کیلئے ایک نظم

محبّت بیان نہیں، روّیہ ہے

اس بات کا اندازہ

ہمیں اس وقت ہوا

جب ہم نے

بہار کی سبز روشنی میں نہائے ہوئے بیجنگ پر قدم رکھا

رفاقت کی، سُوجھ بُوجھ رکھنے والی خوشبو ہماری منتظر تھی

ہم ایک دُوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے

لیکن ہمارے ہاتھوں کی حرارت

اس ناواقفیت کی تلافی کر رہی تھی

ہمارے ہونٹ خاموش تھے

لیکن ہماری آنکھیں مکالمہ کر رہی تھیں

ہمارے درمیان وہ خاموشی تھی

جو بہت پُرانے دوستوں کے بیچ ہوتی ہے!

عظیم ملک کے عظیم لوگ

جنھوں نے ایک روشن اور خوشگوار دن کیلئے

ایک طویل رتجگے کی ذمہ داری قبول کی

جنہیں ہماری شناخت، اپنی پہچان کی طرح عزیز ہے

جنہیں ہماری بے سروسامانی کی خبر

سب سے پہلے ہو جاتی ہے

جو ہمارے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے

ہماری کلاہ سے کبھی نہیں کھیلتے

وہ لوگ کہ جن کے پاس رہتے ہوئے

ہمارے پاس کوئی ترجمان نہ بھی ہوتا

تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا

وہاں تو دلوں اور گھروں پر ایک دستک کافی ہے

پاکستان!

میں وہ بچی کس طرح بھول سکتی ہوں

جس کی آنکھیں مخملیں تھیں اور

اور جس کے چمکدار بالوں میں سُرخ ربن بندھا تھا

اور جو محض لباس سے ہمیں پہچان کر

ہم سے لپٹ گئی تھی!

راکاپوشی کے اُدھر جانے والی ہوا

اگر تجھے کوئی مخملیں آنکھوں

اور سُرخ ربن والی بچی ملے

تو اس سے کہنا

ننھی پری

تمہارا ایک گھر

ہمالہ کے اس طرف بھی ہے!



SAN FRANCISCO

حدِ نظر تک
زمین کا رنگ سبز ہے
اور ڈھلانوں پر
سُرخ رنگ کے گھر کھلے ہوئے ہیں
اپنے مکینوں کی طرح
کشادہ دل
دو قدم چلیں
اور کوئی نہ کوئی شفّاف چشمہ
ایک شریر بچے کی طرح
آپ پر پانی اُچھال دے
ذرا آگے بڑھیے
اور ایک ہلکورے لیتی جھیل
آپ کو اپنی مُسکراہٹ کے ہالے میں سمیٹ لے
سارا شہر ہی باغ لگتا ہے
شام تک
تِتلیاں آپ کے ہمراہ ہوتی ہیں
اور رات کو جگنو ہنستے ہوئے آ جاتے ہیں
زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کہیں کسی پُھول پر نہ آ جائے!
اے خدا
اس شہر کو ہمیشہ آباد رکھنا
یہ تیرے بندوں کو
تجھ سے قریب لاتا ہے!



ایک افسرِ اعلیٰ کا مشورہ

میرے ایک افسرِ اعلیٰ نے
ایک دن مجھے اپنی بارگاہِ خاص میں طلب کیا
اور ایک دو فائلوں کا حال پوچھنے کے بعد
میری غیر سرکاری مصروفیات پر چیں بہ جبیں ہوئے
معاشرے میں شاعر کی اوقات پر روشنی ڈالی
خلاصہ گفتگو یہ کہ
ملک میں شاعر کی حیثیت وہی ہے
جو جسم میں اپنڈکس کی
بے فائدہ ____ مگر کبھی کبھی سخت تکلیف کا باعث
سو اس کا ایک ہی حل ہے ____ سرجری!
چشمِ تصوّر سے، میری شخصیت کے اپنڈکس سے نجات پا کر
کچھ شگفتہ ہوئے
پھر گویا
ایک آئیڈیل افسر وہ ہے
جس کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا
پہلے اُس کے ہونٹ غائب ہوتے ہیں
پھر آنکھیں
اس کے بعد کان
آخر میں سر
ہونٹوں، آنکھوں، کانوں اور سر سے نجات پائے بغیر
کوئی افسر، فیڈرل سیکرٹری نہیں بن سکتا!

اپنی بات پر زور دینے کیلئے

انہوں نے دو ایک مشہور سر کٹے افسروں کا حوالہ دیا

لیکن میرے چہرے پر

شاید انہوں نے پڑھ لیا تھا

کہ یہ بے وقوف لوکل شاعرہ رہنے ہی میں خوش ہے

سو بدمزہ ہو کر

انہوں نے مجھے واپس جانے کی اجازت مرحمت فرما دی

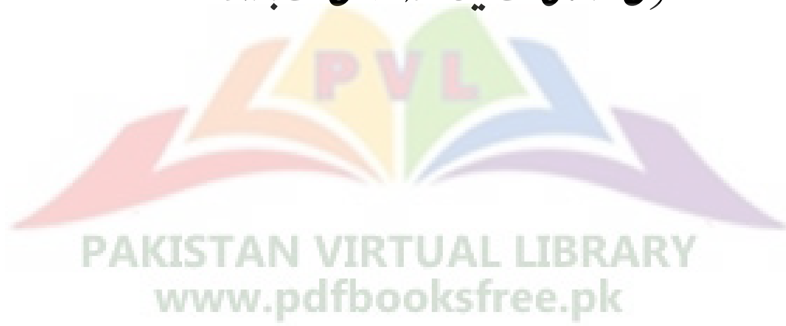
اور میں بے وقوف

ایک نئی نظم کو سوچتی ہوئی اپنے دفتر لوٹ آئی

اپنی A.R.C میں

سُرخ روشنائی کے ایک ممکنہ اندراج کے باوجود!





ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ

میں نے اپنے لان میں احتیاط سے پانی دیتے ہوئے

کنٹونمنٹ بورڈ کو کافی برا بھلا کہا

بھلا یہ بھی کوئی کارگردگی ہے

جس میں پُھولوں کو پانی میّسر نہ آ سکے

میرے سارے امپورٹڈ پودے مُرجھائے جاتے ہیں!

میں نے دِل ہی دِل میں

ایک چلتے ہُوئے اخبار کے مدیر کے نام

ایک مراسلہ بھی ڈرافٹ کر دیا

ابھی میں طنز کی دھار غصے کی سان پر رکھ رہی تھی

کہ مجھے باہر ایک بچہ نظر آیا

جس کے دونوں کاندھوں پر

ایک ڈنڈا رکھا تھا

اور ڈنڈے سے دو کنستر بندھے ہوئے تھے

اور حسرت بھری نظروں سے پائپ کی طرف دیکھا

میرا دل کٹ گیا

مگر

میں نے اس سے کہا

بیٹے

اگر میں ان کنستروں میں پانی بھر دوں

تو ان کا وزن تمہارے وزن سے بڑھ جائے گا

تم ایک قدم نہیں چل سکو گے

اور گھر نہیں جا سکو گے

اور اچھے بچے دیر تک گھر سے باہر نہیں رہتے

بچے کی آنکھیں اچانک پچاس سال کی ہو گئیں

اُن میں ایک جُھریوں بھرا زہرخند ابُھرا

پھر وہ خاموشی سے

باہر چلا گیا!

میں نے اپنے ڈرافٹ کی عبارت میں

ایک سطر کا اور اضافہ کر دیا!



کراچی

کراچی
ایک ایسی بیسوا ہے
جس کیساتھ
پہاڑوں' میدانوں اور صحراؤں سے آنے والا
ہر سائز کے بٹوے کا آدمی
رات گزارتا ہے
اور صبح اُٹھتے ہی
اُس کے داہنے رُخسار پر
ایک تھپڑ رسید کرتا ہے
اور دُوسرے گال کی توقع کرتے ہُوئے
کام پر نکل جاتا ہے
اگلی رات کے نشے میں سرشار!



کلفٹن کے پُل پر ....

کلفٹن کے پُل پر
جس سے شہر کی الیٹ گزرتی ہے
اور سوگز کی حد میں
ٹریفک پولیس کے چاق وچوبند جوان
ہمہ وقت ڈیوٹی دیتے ہیں
چھ' سات سادہ لباس والے بھی ہوں گے
اِردگرد کوئی غیر متعلق پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا!

میں نے اُسے دیکھا!
گہرے نارنجی سوٹ میں ملبوس
جس پر بنا ہوا تِلّے کا کام
مناسب مقامات سے مسکا ہوا تھا!
اس کی لپ اسٹک اتنی گہری تھی
کہ نظریں لتھڑ گئیں تھیں
وسطِ مئی کی دُھوپ میں، بہتا ہوا فاؤنڈیشن
یہ کہہ رہا تھا
کہ عمارت بھی کبھی حسین نہیں تھی
سستی سی نیل پالش میں ڈوبی ہوئی انگلیوں میں
ایک سگرٹ پھنسا تھا
جسے وہ دھواں دار پی رہی تھی
اس کی تمام حرکات وسکنات
دفعہ ۲۹۴ کے تحت قابلِ دست اندازیٔ پولیس تھیں
ٹریفک سگنل پر رُکے ہوئے میں نے سوچا
منٹو کی اس ہیروئین کا، یہ سپاہی
ابھی دھڑن تختہ کر دے گا
وہ اس کی طرف بڑھا
لیکن اس سے قبل
کہ وہ اپنی نوٹ بُک نکالتا
گہرے نیلے نمبر پلیٹ کی ایک کار
اُس کے پاس رُکی
اور وہ اپنی دفعہ ۲۹۴ کے اشاروں سمیت
کار میں غائب ہوگئی
سفید کپڑوں والے سپاہی کی دونوں ایڑیاں

جُڑی کی جُڑی رہ گئیں!



کتنے برس لگے ....

کتنے برس لگے

یہ جاننے میں

کہ میرے اندر تیرا ہونا کیا ہے

ایسا ہونا بھی چاہیے تھا

شام ہوتے ہی

چاند میں روشنی نہیں آ جاتی

رات ہوتے ہی

رات کی رانی مہک نہیں اُٹھتی

شام اور روشنی کے بیچ

رات اور خوشبو کے بیچ

ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے

جس کا ہماری زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

اس آسمانی لمحے نے

اب ہمیں چُھو لیا ہے!



چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں

شروع راتوں کا چاند تھا

پھر بھی

سارا باغ روشنی سے بھرا ہوا تھا

جیسے ہمارے دل

محبت سے!



(۲)

چاند کی آخری تاریخیں تھی

کُنجِ چمن کی خوشبو بھری تاریکی میں

اُس نے دیے کی لَو کو اونچا کیا

اور میری آنکھوں میں جھانکا

پھر ہمیں کسی دیے کی ضرورت نہیں رہی!



I'LL MISS YOU

جانے سے پہلے

اُس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا

I'LL MISS YOU

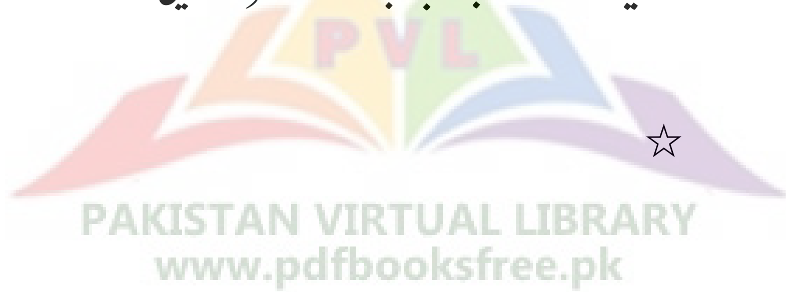
سارا سفر

خوشبو میں بسا رہا!



مشورہ

ہماری محبت کی کلینکل موت واقع ہوچکی ہے!
معذرتوں اور عذرخواہیوں کا مصنوعی تنفس
اسے کب تک زندہ رکھے گا
بہتر یہی ہے
کہ ہم منافقت کا پلگ نکال دیں
اور ایک خوبصورت جذبے کو باوقار موت مرنے دیں!



اُسے اِس بات کا پتہ نہیں

اُس نے کہا
ہم جب بھی سفر پہ نکلتے ہیں
بارش ہمارے ساتھ ہو لیتی ہے
ایک تیسرے شخص کی طرح
اُس کے لہجے میں چھپی ہلکی سی خفگی پر
میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی
مجھے احساس ہے
کہ کبھی کبھی
اُس کے کسی سوال کا جواب

میں بارش کو دے دیتی ہوں

مگر اُسے اس بات کا پتہ نہیں

کہ جس حبس بھری دُنیا میں ہم رہتے ہیں

وہاں

بارش ہی ہماری دوست ہوسکتی ہے!



مُجھے جان لینا چاہیے تھا

وہ مُجھے اس وقت ملا

جب پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی

چیری کے درختوں پر اوّلین شگوفے پُھوٹ رہے تھے

نوخیز خوشبو سے سارا باغ روشن تھا

بلبل نے بس ابھی چہکنا شروع کیا تھا

اپنے بازوؤں میں لئے

وہ مُجھے پھولوں بھری وادی میں

گھومتا رہا

ہم تتلیاں اور جگنو پکڑتے رہے

بارش ایک پیاری دوست کیطرح

ہمارا ہاتھ بٹاتی رہی

جس دن درخت سے پہلا پتّہ گرا

میں اُسے اُٹھانے کے لئے جُھکی

پلٹ کر دیکھا

تو وہ جاچکا تھا!

اب میں ٹوٹے ہوئے پتّوں میں

اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں

مُجھے جان لینا چاہیے تھا

کہ اُس کا اور میرا ساتھ

موسمِ بہار تک ہے!



مَلبے پر لکھی گئی ایک نظم

دیمک ہماری نیو میں اُتر چکی تھی

سو میں نے اُسے بُل ڈوزر چلانے کا اختیار دے دیا!

آج میں اپنے مَلبے پر بیٹھی

سوچ رہی ہوں

ٹپکتی ہوئی چھت

اور گرتی ہوئی دیواروں نے

کتنے بھیڑیوں کو

مجھ سے دُور رکھا تھا!



پروین قادر آغا

جب میرے سر سے چادر اُتری

تو میرے گھر کی چھت میرے لئے اجنبی ہوگئی

''تم ہمارے لئے مر چکی ہو''
اہلِ خانہ کی خاموشی نے اِعلان کیا
اور میں بابُل کے دروازے سے
دستک دیے بنا
لوٹ آئی
میں نے
(بڑے مان سے)
اپنے پریمی کی طرف دیکھا
مگر اس کی آنکھوں میں برف جم چکی تھی
(جیسے میرے لئے ان جھیلوں میں کنول کبھی کِھلے ہی نہ تھے)
اب میں کُھلے آسمان تلے کھڑی تھی
اپنے لال کو سینے سے لگائے
یا اللہ! میں کہاں جاؤں
سر پہ پہاڑ سی رات
چاروں طرف بھیڑیے
اور عورت کی بُو سونگھتے ہوئے شکاری کتّے
''ہمیں گھاس نہ ڈالنے کا نتیجہ'' کہتی آنکھیں
''ہمیں موقعہ دو'' کہنے والے اشارے
اور چیتھڑے اڑانے والے قہقہے
اور مار دینے والی ہنسی
ٹھٹّھے کرتی ہوا
اور فقرے کَستی بارش
ہر طرف سے سنگباری!

مجھ میں اور پاگل پن میں

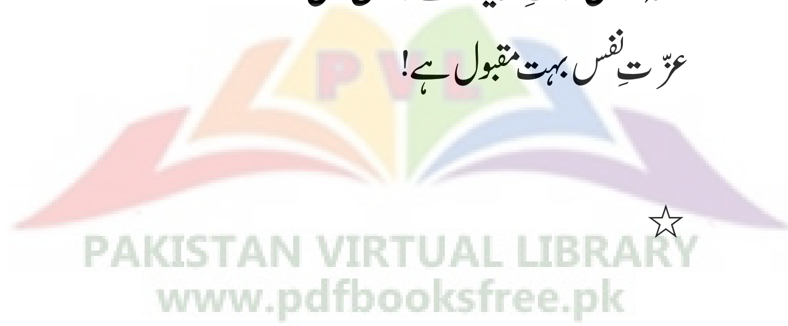
بس ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا
خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی
قریب تھا کہ
میں اُس کے ہاتھ آجاتی
کہ ایک سایہ میری طرف بڑھا
اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا
''ہمیں کسی کی پرواہ نہیں
تم جیسی بھی ہو، ہمیں عزیز ہو!''
اُس دن
میں اتنا روئی
کہ دُنیا اگر ایک خالی تال ہوتی
تو میرے آنسوؤں سے بھر جاتی
میرا ملامت بھرا وجود
اُس دن سے آج تک
اُس مہربان سائے کی پناہ میں ہے
خدا
کبھی کبھی
اپنے فرشتوں کو
زمین پر بھی بھیج دیتا ہے!

☆

ہم سب ایک طرح سے ڈاکٹر فاسٹس ہیں

ہم سب ایک طرح سے
ڈاکٹر فاسٹس ہیں

کوئی اپنے شوق کی خاطر
اور کوئی کسی مجبوری سے بلیک میل ہو کر
اپنی رُوح کا سودا کر لیتا ہے
کوئی صرف آنکھیں رہن رکھوا کر
خوابوں کی تجارت شروع کر دیتا ہے
کسی کو سارا ذہن ہی گِروی رکھوانا پڑتا ہے
بس دیکھنا یہ ہے
کہ سکّۂ رائج الوقت کیا ہے
سو زندگی کی WALL STREET کا ایک جائزہ
یہ کہتا ہے
کہ آجکل قوّتِ خرید رکھنے والوں میں
عزّتِ نفس بہت مقبول ہے!



☆

پھر وہی فرمان

کلچر کی باگ دوڑ
پارٹی ACTIVITIES نے سنبھال لی ہے
اب راگوں کی چُولیں
ترکھان بٹھائیں گے
اور شاعری
کمہاروں کے آوے میں پکا کرے گی
مصوّری کو لوہار کی دھونکنی کی ضرورت ہے
''بہت ہو گئی رجعت پسندی

رابطے کا ہر وسیلہ اب ہمارا ہے

خفیہ یا قومی''

''بیان ادھورا رہ گیا......''

''تو رہتا رہے''

''مغنیہ ابھی استھائی پر تھی.......''

''کوئی بات نہیں

انترہ ہم خود اُٹھالیں گے''

''لیکن حضور ایک نظر رومانیہ اور چیکوسلوا کیہ اور مشرقی جرمنی پر تو ڈالیں

خود قبلہ گاہی گورباچوف......''

''ہمیں خبر ہے

''مگر ہم GLASNOST کی خرافات میں نہیں پڑنا چاہتے

ہر وہ شخص جو ہماری اجازت کے بغیر

گزشتہ برسوں زندہ رہا

غدّار ہے

اور غدّاری کی سزا موت ہے

اور زندہ بچ جانے والوں کو خبر ہو

کہ وفاداری کے سرٹیفکیٹ پر اَب ہمارے دستخط ہوں گے

رسّہ کھینچنے کا اختیار ہمیں مل چکا ہے!''



سندھو دریا کی محبّت میں ایک نظم

ہریالی دریا کے دونوں جانب ہوتی ہے
وہ پہاڑوں اور میدانوں میں بہتے ہوئے
پتھروں اور پُھولوں سے یکساں سلوک کرتا ہے
مچھلیاں پکڑتے ہوئے
کبھی کسی مچھیرے سے اُس کا ڈومی سائل نہیں مانگتا
بلکہ شکریے کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے
ہوا اور بادل کی طرح مہربان اور بے نیاز
مگر جب اُس کے کناروں پر رہنے والے
اُس کے پانیوں میں نفرتیں ملانے لگیں
اور بچّوں اور پھولوں کو
والیوں اور مالیوں کا شجرہ دیکھ کر
پانی کا پرمٹ جاری کرنے لگیں
اور یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہے
تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے
کہ ایسے موقعوں پر
دریا اپنا جغرافیہ تبدیل کر لیتے ہیں!

میرا خیال ہے
ہمارے لئے
فی الحال ایک موہن جو داڑو کافی ہے!

ختم شد